اُردو

دیوانِ غالبؔ

معہ شرح نظامی

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

…زا اسداللہ خاں غال

پوچھتے ہیں وہ کہ "غالب کون ہے"؟ ❖ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟



نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی

خط مرزا غالب

جناب قاضی صاحب کو میری بندگی پہنچے مکرمی مولوی غلام غوث خاں بہادر منشی

کا قول سچ ہے اب میں تندرست ہوں پھوڑا پھنسی زخم جراحت

کہیں نہیں مگر ضعف کی وہ شدت ہے ہم خدا کی پناہ ضعف کیونکر

نہ ہو برس دن صاحب فراش رہا ہوں ستتر برس کی عمر جتنا خون بدن میں

تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا سن نمو

کہاں جو اب پھر تولید دم صالح ہو بہر حال زندہ ہوں

اور ناتوان اور آپ کے مرحمت نامہ کا ممنونِ احسان

والسلام مع الاکرام نجات کا طالب غالب

چہار شنبہ ۱۰ جمادی الثانی سنہ ۱۲۸۰ مطابق [illegible] نومبر سنہ ۱۸۶۳ع

(ضمیمہ دیوان غالب مطبوعہ نظامی پریس)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع ثالث

نظامی پریس بدایوں نے سید راس مسعود صاحب بی۔ اے آکسن کی تحریک سے ۱۹۱۵ء میں اردو دیوان غالب کو سب سے پہلی مرتبہ تعلیم یافتہ طبقہ کی نفاست پسند طبائع اور ساتھ ہی اُن کے عالمانہ مذاق کو ملحوظ رکھ کر شائع کیا تھا

خدا کا شکر ہے کہ آج اسی مطبع سے وہ دیوان تیسری دفعہ چھوٹی تقطیع پر مزید اہتمام سے آراستہ پیراستہ سنہرے کام کی خوشنما جلد سے مزین "طاؤس جنت"[1] بنکر نکلتا ہے پہلا نسخہ تو معرا تھا لیکن یہ طبع سوم اپنے پیش رو کی طرح حامل شرح ہے۔ اس مرتبہ شرح پر نظر ثانی کی گئی ہے اور مرزا کے خطوط سے مدد لیکر بعض معرکۃ الآرا اشعار کی شرح خود مرزا کی زبان سے لکھی گئی ہے جس کی وجہ سے اس شرح کی ایک خاص امتیازی صورت پیدا

---

[1] مرزا کے خطوط کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کتابوں کی اشاعت میں خوشنمائی اور دلربائی کا خیال موجودہ زمانے کے نفاست پسند انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں سے کم نہ تھا۔ ایک خط میں اپنے ایک شاگرد صاحب مطبع منشی شیو نراین کو ایک مطبوعہ کتاب کی رسید بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بھائی صاحب! ۔۔۔ کتابیں بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نراین کی کل جمعہ کی ۱۲ نومبر کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے ازروئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس جنت بنجائیں گی حوریں ان کو دیکھ کر شرما جائیگی" (اردوئے معلیٰ) ۱۲

ہوگئی ہے۔ اس جدید نسخے کو ریاست رام پور کے سرکاری کتب خانہ[1] کے قلمی دیوان سے جو ۱۸۵۵ء (سنہ ۱۲۷۱ھ) کا لکھا ہوا ہے مقابلے کی غرض[2] حاصل ہوئی ہے۔ آخری صفحات میں مرزا کے وہ قطعات اور اشعار جو اصل دیوان کے علاوہ ہیں اور جو اس سے پہلے کسی نسخے میں نہیں چھپے ہیں شامل کر دیے گئے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس جدید الطبع نسخہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ڈاکٹر سید محمود صاحب غازیپوری پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا کا وہ عالمانہ مقدمہ ہے جس کو اُنھوں نے اس خاکسار کی درخواست پر لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ یہ مقدمہ اسی سرزمین پر بیٹھ کر لکھا گیا ہے جہاں مرزا نے اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا تھا اور جس خاکِ پاک میں آج بھی وہ آسودہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مقدمہ کے مرتب کرنے کے دوران میں مزار غالب کی زیارت کی غرض سے سلطان جی[5] میں جاکر عالمِ خموشاں کی بھی سیر کی اور کیا عجب ہے کہ وہاں مرزا غالب کے روحانی فیض سے

---

[1] یہ وہی قلمی دیوان ہے جس کو مرزا نے قبل ہنگامہ ۱۸۵۷ء نواب محمد یوسف علی خاں بہادر والیِ رام پور کے نذر گزرانا تھا۔ اس کے آخر میں نواب ضیاء الدین خاں نیر کی ایک دلچسپ تقریظ بھی شامل ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس دیوان میں کل ۱۷۹۰ اشعار ہیں۔ مرزا کے ایک خط مورخہ ۱۴ مئی ۱۸۶۰ء سے جو منشی شیو نراین صاحب کے نام لکھا گیا اور جو اردوے معلےٰ میں موجود ہے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۶۱ء سے قبل جو نسخہ مرزا کے دیوان کا طبع ہوا تھا وہ نایاب ہو چکا تھا جب ان کے دوستوں نے اس دیوان کو شائع کرنا چاہا تو یہی نسخہ موجودہ کتب خانہ رام پور کی نقل حاصل کر کے اس کو مطبع میں بھیج دیا گیا تھا۔ گویا آج تک مرزا کے کلام کو زندہ رکھنے کا سبب یہی قلمی دیوان ہے۔ (نظامی)

[2] دہلی میں اس مقام کو جہاں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کا مزار ہے "سلطان جی" کہتے ہیں۔ (۲)

(ردیف و)

ردیف ہ

ردیف ی

قصائد

قطعات

سہرا

مدح

رباعیات

مستفید ہوئے ہوں۔ جیسا کہ اس مقدمہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی جن میں
اُنھوں نے وہ وہ نکات پیدا کیے ہیں جو آج تک مرزا غالب کے سوانح نگاروں یا ان کے
کلام پر تنقید کرنے والوں کو نہ سوجھے تھے۔ اس طبع میں مرزا کی تصویر کے علاوہ ان کے
ایک غیر مطبوعہ خط کا فوٹو بھی دیا گیا ہے جس سے مصنف کی شان خط کی زیارت ہو جاتی
ہے۔ یہ خط قاضی عبدالجمیل صاحب بریلوی کے ذخیرہ سے نکال کر ان کے خلف الصدق
قاضی محمد خلیل صاحب رئیس بریلی نے ہمیں عنایت کیا ہے جس کے لیے ہم ان کے
شکر گزار ہیں یہ خط پہلی مرتبہ شائع ہوتا ہے اس سے قبل اُردوے معلّے وغیرہ کے ناشرین
کی اس خط تک دسترس نہیں ہوئی تھی۔ شروع میں ناظرین کی آسانی کے لیے غزلوں
کی ایک فہرست بقید صفحہ بطور انڈکس دی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس جھوٹی تقطیع کے جدید
نسخے کو دل آویز اور نظر فریب بنانے میں حتی المقدور کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا گیا ہے۔
خدا کرے کہ وہ موجودہ زمانہ کی نفاست پسند جدید تعلیم یافتہ جماعت میں مقبول ہو اور
اس کی اشاعت سے مصنف کی روح محظوظ ہو۔

خاکسار نظامی بدایونی

۶ر دسمبر ۱۹۱۹ء

(۱۸۹۶ء)

مقدمہ

(از جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لا پٹنہ)

تمہید دیوان غالب کو آب وتاب کے ساتھ شائع کرنے کا خیال سب سے پہلے میرے معزز دوست سید راس مسعود صاحب بی۔ اے (آکسن) کو ہوا۔ ادبیات سے جو شوق ان کو ہے غالباً وہی اس بات کا محرک ہوا کہ اردو علم ادب کے خدائے سخن کو ایسی کس مپرسی کی حالت میں نہ رہنا چاہیے جس میں کہ وہ ابتک ہماری غفلتوں اور لاپرواہیوں سے پڑا ہوا ہے۔ غیر ملکوں کے لٹریچر کے مطالعہ نے اُن پر ثابت کیا ہوگا کہ قومی یا ملکی ترقی کے لیے اعلیٰ علم ادب کس درجہ ضروری اور لازمی ہے اور بغیر اس کے کوئی قوم مدارج ترقی کے پہلے زینہ پر بھی قدم رکھنے کا دعوے نہیں کرسکتی۔ چنانچہ ان کی تحریک پر مولانا نظامی بدایونی نے دیوان غالب کا پہلا اڈیشن نفیس کاغذ اور صاف ستھری چھپائی کے ساتھ ملک میں پہلی مرتبہ شایع کیا دوسرا اڈیشن اور زیادہ عمدگی اور صحت کے ساتھ نکلا۔ تعلیم یافتہ گروہ نے اس کی قدر کی جس سے پتا چلا کہ اہل ملک **غالب** کی عظمت کو پہچاننے اور اس ترجمان حقیقت کے فلسفیانہ خیالات کو سمجھنے لگے ہیں۔ ان دونوں اشاعتوں کے بعد اس ہیچمیرز نے نظامی صاحب کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے تحریک کی کہ اب تیسرا اڈیشن پاکٹ اڈیشن کی صورت میں شائع ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی چند اور تجاویز بھی پیش کیں۔ مولانا نظامی نے میری تجاویز کو تو منظور کر لیا لیکن اس

تصویر کے بدلے ساتھ ہی میری سزا بھی تجویز کر دی اور مجھ سے یہ فرمائش کی کہ میرے اڈیشن کے لیے مقدمہ تم لکھ دو۔ اور اس پر اصرار اور سخت اصرار ہوا میں نے اپنی حماقت سے کچھ تو الامر فوق الادب کا لحاظ کر کے اور کچھ سزا کی اہمیت کو نہ سمجھ کر وعدہ کر لیا۔ آج چھ ماہ کے بعد تقاضوں سے تنگ آکر ایفائے وعدہ کی کوشش کر رہا ہوں اور اب مجھے پتا چل رہا ہے کہ جس چیز کا میں نے بلا سمجھے بوجھے وعدہ کر لیا تھا وہ میرے بس کا کام نہیں تھا۔ حُسن اتفاق سے آج کل دلی آیا ہوا ہوں اور یہ چند اوراق[1] پریشان اسی پاک سرزمین پر لکھے گئے ہیں جہاں وہ کشاف راز فطرت مرزا اسد اللہ خاں غالب بقائے دوام کا جام نوش کر کے پڑا سو رہا ہے۔

"میری تصانیف میں لوگوں کو تیری ہی تصویریں نظر آتی ہیں۔ وہ آتی ہیں اور مجھ سے پوچھتی ہیں "وہ کون ہے" مجھے نہیں معلوم انھیں کیا جواب دوں؟ میں تیرے فسانے اپنی غیر فانی نغموں میں سنایا کرتا ہوں۔ ہمارا دل [illegible] عیاں ہو جاتا ہے۔ وہ آتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں "بتا ان سے تیرا کیا مطلب ہے" میں نہیں جانتا انھیں کیا جواب دوں۔

میں کہتا ہوں آہ! کون جانتا ہے ان کا کیا مطلب ہے" (ٹیگور)

شاعری کیا ہے؟ اس کا جواب کچھ آسان نہیں سینٹ آگسٹن نے اس کا جواب ایک دلفریب پیرایہ میں دیا ہے وہ کہتا ہے "اگر مجھ سے نہ پوچھو تو مجھے معلوم ہے اور اگر پوچھو تو میں جانتا نہیں" گو ہم میں سے ہر ایک شخص کو اس امر کا علمی احساس ہے

[1] استادی مولوی رشید احمد صاحب انصاری پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے چند مفید مشورے ملے

کہ شاعری کسے کہتے لیکن اس احساس کا صحیح الفاظ میں اظہار اگر غیر ممکن نہیں تو دقت طلب ضرور ہے جانسن کی رائے میں شاعری اُس فن کا نام ہے جو قوتِ متخیلہ کے توسل سے انبساط او حقیقت کو ملا دیتا ہے اور اُس کا نتیجہ ایجاد ہوتا ہے۔ کارلائل کہتا ہے کہ شاعری ایک موسیقانہ خیال ہے۔ شیلے اس کی تعریف یوں کرتا ہے کہ شاعری قوتِ متخیلہ کا انکشاف ہے۔

دراصل یہ وہ فن ہے جس کے ذریعہ سے لفظوں کا استعمال کر کے پردہ تصوّر پر خیالی نقش و نگار ثبت کیے جاتے ہیں۔ جو کام مصوّر رنگوں کے استعمال سے لیتا ہے وہی کام شاعر الفاظ کے ذریعہ سے نکالتا ہے۔ شاعری جذبات اور خیالات کی بولتی ہوئی تصویر اور حُسن و حقیقت کی تشریح ہے۔ یہ انسانی قلب کے کیفیات کو سریلی زبان کے ذریعہ سے معرض بیان میں لاتی ہے۔ لٹریچر انسانی زندگی کی ایک تفسیر ہے اور بقول ہکین شاعری انسانی قلب کے لیے اُن اُمور میں تسکین دہ ثابت ہوتی ہے جن کا فطرت نے کوئی انسداد نہیں کیا۔ شاعری کے اعلے مفہوم کے لیے ضروری ہے کہ خواہ شاعر فلسفی ہو یا نہ ہو لیکن اُس کی صناعی کی عمارت ایسی مستحکم بنیاد پر قایم ہو جس میں تزلزل نہ آسکے۔

ہر ایک شاعر کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ جب تک اُس کی غرض عالم حُسن سے محض ذوق و سرور حاصل کرنا ہے اُس کی قوتِ متخیلہ کے پرواز کے لیے کافی وسعت ملنی چاہیے لیکن جب وہ مصلح بنتا ہے تو ہم اس امر کے طلبگار ہوتے ہیں کہ

اُن کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ مسٹر ممتاز حسین و مسٹر رؤف علی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ۱۲

اُس کی تعلیم و تلقین وہم و ادراک کے واسطے اطمینان بخش ثابت ہو اور نیز تخیل کے لیے دلکش اور قلب کے لیے موثر ہو۔ حقیقی شاعری ہماری نگاہوں میں وہ تجلی پیدا کرتی ہی جس سے ہم حسن کی جلوہ افرزیوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں نیز روحانی معنی کے دروازے ہماری آنکھوں کے سامنے کھل جاتے ہیں۔

غالباً ہم میں ایسے اشخاص کم ہوں گے جو شاعرانہ بصیرت اور ادراک سے محروم ہوں اور جن کے حصہ میں یہ لطیف تخیل اور خداداد جوہر نہ آیا ہو لیکن اکثر ایسا ہوتا ہی کہ وہ تھوڑی بہت شاعرانہ استعداد جو خداوند عالم نے ہم میں ودیعت کی ہی مادی تاثرات کے عمل سے ایک عرصہ کے بعد بالکل مفقود اور کالعدم ہو جاتی ہی۔

فطری شاعر وہ ہی جس میں مجازی حسن کے مشاہدے اور حقیقی معنی کے ادراک کی قوت ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُس میں فطرت کی طرف سے ایسی قوت ودیعت کی گئی ہو جس سے وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو ایسے رنگ میں بیان کرے کہ ہماری آنکھوں میں اُس کا سماں بندھ جائے اور ہمارے جذبات مشتعل ہو جائیں۔ وہ ہمارے قلوب کو اپنی طرف کھینچ لے اور اپنے الفاظ کی بندش اور بیان کی رنگینی سے ہمارے سامنے وہی تصویر کھینچ دے جس کو وہ خود دیکھتا اور خود محسوس کرتا ہی۔

شاعری ہمارے تخیل کو استوار اور ہماری ہمدردی کو مستحکم کرتی اور ہماری شاعرانہ ترجمانی کی قوت کو رفتہ رفتہ بڑھاتی ہی۔ لیکن اگر تخیل اور احساسات کے ذریعہ سے اسرار حیات کی ترجمانی کا نام شاعری ہو تو اُس کو سب سے

بڑی اہمیت اُس قوت سے حاصل ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ زندگی کے اہم ترین معاملات ہماری نظر کے سامنے پیش کرتی ہے دنیا کے بڑے اور نامور شاعر ہمیشہ مانتے آئے ہیں کہ زندگی ہی شاعری کی بنیاد ہے زندگی ہی سے اس کا تعلق ہے اور زندگی ہی سے اس کا وجود ہے۔

اس بنیادی اصول کو مدنظر رکھ کر شعرا نے کارنمایاں کیے ہیں اور زندگی کو بخوبی سمجھنے اور اس کی صحیح ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے اور دراصل یہی اُن کی عظمت کا ثبوت ہے۔ کلام میں خاص خاص خیالات کی محض موجودگی یا غیر موجودگی سے کچھ زیادہ فرق نہیں پیدا ہوتا بلکہ جو چیز کسی شاعر کے کلام کو زیادہ موثر بناتی ہے وہ دراصل اُس کا وہ پیرایہ بیان ہے جس میں خیالات کا اظہار کیا گیا ہو کسی نظم کے مطالعہ کے وقت شاعر کی وسعت نظر اور اُس کی شخصیت کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے اور پھر اس پہلو پر بھی غور کرنی چاہیے جو شاعر کو انفرادی حیثیت سے متمیز کرتا ہے۔

غالب کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالنا حقیقتاً کچھ آسان کام نہیں ہے۔ اس کی بلند پروازی اور شوکت خیالات۔ اُس کا تصوف۔ اس کی فہم رسا اور عظمتِ تخیل۔ اُس کا عجیب اور انوکھا طریقہ بیان اور اُس کی صناعی وہ چیزیں ہیں کہ جن کو بخوبی سمجھنا اور الفاظ کے ذریعہ سے بیان کرنا میری استعداد سے بالاتر ہے۔

مولانا حالی جیسا نکتہ رس اور صاحبِ ذوق سلیم ہی اس کام کو سرانجام دینے کی اہلیت رکھتا تھا مولانا حالی کی کتاب یادگار غالب بےشک ایک قابلانہ تصنیف ہے لیکن یہ محققانہ و عالمانہ تصنیف بھی شیدایان غالب کی پیاس

نہیں سمجھاتی۔ وہ غالب کی حقیقی عظمت کا بہت تھوڑا حصہ ظاہر کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا ممدوح نے زمانہ کی قدر ناشناسی اور ابنائے زمانہ کی منتہائے استعداد وقابلیت کا خیال کرکے کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدرِ عُقُولِهِم کے دانشمندانہ مقولہ پر عمل فرمایا ہو اور اُن دقائق کا اظہار مناسب نہ سمجھا ہو جن کو صرف انھیں کی چشم بصیرت کلام غالب میں دیکھ سکتی تھی لیکن اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچان لی تھی اور جو غالب کے کلام کو اپنے حسن معانی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی اور صوفی۔ شاعر اور سائنس داں سب ہی متحیر رہ جاتے۔ آہ! عبدالرحمٰن! عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی اور تو ملک اور قوم کی یہ عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا۔ غالب نے ایسے ہی موقعہ کے لیے اور شاید تیرے ہی واسطے یہ کہا ہے ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی رحمٰن[1]
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

یہ نوجوان فلسفی جو شاعرانہ تخیل سے بھی بہرہ ور تھا ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالب

کون شخص ہے جو دیوان غالب کے مطالعہ کے وقت یہ نہیں محسوس کرتا کہ اس کا مصنف الحقیقی ماہر فن ہے اور شاعری خدا کی طرف سے اُس کو ودیعت کی گئی ہے۔ اور اُس کی شاعری کسبی نہیں ہے۔

[1] ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اصل شعر میں عارف ہے

اس کی شیریں بیانی اور مذاقِ سلیم۔ اس کی بلاغت و فصاحت۔ اس کی عظمت اور بلندیٔ خیال۔ اس کی سنج و خوشی اس قدر دقیق۔ اس قدر لطیف اور اس قدر نازک ہیں کہ ضبط تحریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔

غالب کی ہستی اُن چیدہ اور برگزیدہ خاصانِ خدا کے گروہ سے ہے جن کا وجود ابدی ہے۔

غالب کی ذکاوت و بزرگی اس کی مستحق تھی کہ اُس کی شہرت چار دانگ عالم میں ہوتی۔ وہ ایک غیر معمولی طور پر ذکی پیشین گو فلسفی اور ایک بلند پایہ شاعر ہے جس کے قصائد انوری و خاقانی کے قصائد سے مرتبہ میں کم نہیں جس کی غزلیات عرفی و طالب کی غزلیات پر فوقیت رکھتی ہیں جس کی رباعیات فارسی عمر خیام کی رباعیات سے کم و قیع نہیں اور جس کی نثر ابو الفضل اور ظہوری کی نثر سے کہیں زیادہ شاندار ہے۔

وہ حسن و حقیقت کا پرستار ہے اور زندگی کے مختلف ترانوں کا مُغنّی۔ اگر وہ ایک طرف آتش سیال اور شرمیلے گلاب کی تعریف میں نغمہ سرا ہوتا ہے تو دوسری طرف فلسفہ کے دقیق اور اہم ترین مسائل کا انکشاف کرتا ہے۔ اُس کی فارسی و اُردو دونوں دیوان علم ادب کے بیش بہا جواہر ہیں۔ ان میں لعل و یاقوت گوہر و زمرد سب ایک جا جمع ہیں۔

غالب ایسے وقت بزم شعرا میں رونق افروز ہوا جبکہ اسلامی عروج کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ ملک میں ہر طرف ایک عالم پریشانی طاری تھا اور مشرقی اور مغربی تہذیب کا تصادم ہو رہا تھا۔ پرانی وضع و پرانا تمدن رفتہ رفتہ

نیست و نابود ہوتا جاتا تھا۔ اُس وقت ہر صاحبِ نظر لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کی زبان سے یہ ضرور کہتا ہوگا۔ مصرع

"نئے انداز کی خوشیاں نئے اسبابِ غم ہوگئے"

اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم غالب کے کلام میں افسردگی اور تسلیم و رضا کی نمایاں علامات پاتے ہیں۔ انسانی رنج و خستگی کا احساس اور اُس سے ہمدردی اور اُس احساس و ہمدردی کا عجیب پُر معنی پیرایہ اور دلکش الفاظ میں اظہار کچھ غالب ہی کا حصہ تھا۔ وہ دوسرے شعرا کی طرح انسانی کمزوریوں پر قہقہہ نہیں لگاتا بلکہ وہ خود اُن کمزوریوں سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ روتا ہے۔ گناہ گار کا وہ سچا ہمدرد ہے اور اس ناچیز کی رائے میں سچے مصورِ فطرت کا یہ فرضِ اولین ہے۔

حضرت غالب کی دقیقہ سنجی ان کے ہمعصر اشخاص کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس لیے غالب کے کلام کی قدر و قیمت اُن کے زمانہ میں نہیں کی گئی لیکن ہر ملک میں تقریباً تمام صاحبانِ فن و کمال کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ غالب کی ذات اس سے کیونکر مستثنےٰ ہو سکتی تھی۔ یہ مبالغہ آمیز خودنمائی نہ تھی بلکہ اپنی خداداد مہارت اور بے نظیر کمال کا پورا یقین تھا جس نے اُس خلاّقِ سخن سے یہ اشعار کہلوائے۔

تازہ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن ✽ ایں مے از قحطِ خریدارے کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است ✽ شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

ابھی پورے پچاس برس نہیں ہوئے کہ وہ کشافِ حقیقت اپنے کلام جاودانی

کی نغمہ سرائی چھوڑ کر عالم بقا کو سدھارا اور عاشق صادق اپنے معشوق حقیقی سے جا کر مل گیا اور اس کے لیے "من" و "تو" کا امتیاز باقی نہ رہا جیسا کہ اُس نے خود کہا ہے ؎

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے:

اتنے ہی تھوڑے عرصہ میں اُس کی ہردلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ اس کے دیوان کے متعدد اڈیشن متواتر نکل چکے ہیں اور پھر ہر طرف سے مانگ ہے۔ بہت سے نئی تہذیب کے دلدادہ جو مغربی مادیت سے تنگ آکر حقیقی خوشی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اُن کو غالب کے کلام میں اُس کیفیت وجدانی و سرورِ روحانی کا حظ ملتا ہے جس سے اُن کی طبع ملول کو یک گونہ تشفی و تسکین ہوتی ہے۔ شعرا کا کام نغمہ سرائی کر کے صرف بیچین دلوں کو مسرت بخشنا ہی نہیں ہے بلکہ ملکی و قومی ترقی میں نمایاں حصہ لینا بھی اُن کا فرض ہے۔ شیکسپیر کا کلام انگلستان میں اور گوئٹے کا کلام جرمنی میں بہت کچھ ملکی و قومی ترقی کا باعث ہوا۔ اب آئندہ غالب کا کلام کہاں تک اور کس حد تک اس بدنصیب ملک ہندوستان کی ترقی میں ممد و معاون ہو گا اس کا جواب صرف آنے والی نسلیں دے سکتی ہیں۔

تعمقِ خیال خوبصورتی اور قریباً بے عیب طرزِ ادا وسعتِ نظر۔ عالمگیر ہمدردی و غمخواری۔ انسان اور اس کے خصائل سے گہری واقفیت اور جدتِ تاثیر

یہ تمام خوبیاں غالب کی نظم و نثر دونوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ غالب کے کلام میں شاعرانہ تخئیل کی عظیم الشان بلندیاں پُرسکون فلسفۂ زندگی۔ انسانی ہستی کی رنج اور خوشیاں۔ زندگی کے مکروہات سے صاحبانِ دل کی کشمکش اور رنجیدہ دلوں کو تسکین و راحت دینے کی قوت سب کچھ موجود ہی۔ صرف مطالعہ کرنے والے کو اہلِ دل و صاحبِ ذوق ہونا چاہیے۔ وہ ہم کو زندگی کی حقیقت اُس کی اہمیت اور اُس کا راز بتاتا ہی اور ہم کو خودی کے تاریک غار سے نکال کر ایک غیر متناہی بلندی پر لیجاتا ہی جہاں سے ہم وہ چیزیں دیکھنے لگتے ہیں جن کے بیان سے ہماری زبان قاصر ہی۔

غالب کا مطالعہ کرتے وقت ہر ایک کو یہ احساس ہوتا ہی کہ گویا شاعر اسی کے جذبات دلی کی ترجمانی کر رہا ہی اور یہی کمالِ شاعری ہی۔

شلر کا قول ہی کہ وہ تمام صنعتوں کا مقصد انسان کے لیے خوشی بہم پہنچانا ہی۔ انسان کو کس طریقے سے خوش کیا جائے اس سے زیادہ اہم سوال دنیا میں نہیں ہی۔ سچی صنعت صرف وہی ہو سکتی ہی جو انتہا درجہ کی خوشی و لذت بخشے۔ نظم چاہے کتنی ہی دردانگیز کیوں نہ ہو پڑھنے والے کو اُس سے بھی لطف و خوشی حاصل ہو سکتی ہی غالب کی شاعری میں یہ خاص بات ہی کہ جتنا زیادہ دلسوز مضمون ہوگا اُتنا ہی زیادہ پڑھنے والے کو لطف حاصل ہوگا۔ بہرحال اس سے کون انکار کر سکتا ہی کہ مرزا غالب کا کلام توحید، تصوف، حکمت، فلسفہ، عبرت، بے ثباتی دنیا، خودداری،

جذبات حب الوطنی، ارتقا، تناسخ، وحدت الوجود وغیرہ وغیرہ مسائل اور دوسرے رازِ فطرت کے بہت سے انکشافات سے پُر ہیں تقریباً تمام اُردو شعرا کی غزل گوئی یہ ہے کہ پرانے پامال مضامین جو مدت العمر سے اول عربی پھر فارسی اور اس کے بعد اُردو غزلوں میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بتبدیل الفاظ معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کیے جائیں بقول مولانا حالیؔ "میر سے ذوقؔ تک جتنے مشہور غزل گو اہلِ زبان میں گزرے ہیں ان کی غزلوں میں ایسے مضامین بہت کم نکلینگے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں"

ان کے فن کا کمال یہ ہی سمجھا جاتا تھا کہ جو مضامین پہلے بندھ چکے ہیں کچھ بلیغ اسلوب میں اس طرح ادا کیا جائے کہ نئی بندش پہلی بندشوں سے بڑھ جائے برخلاف اس کے مرزا کی غزل میں ایسی نازک خیالی اور ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں کہ جن کو اکثر شعرا کی فکر نے بالکل چھوا تک نہیں۔

مرزا غالب شارعِ عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اور عامیانہ خیالات اور محاورات سے حتی المقدور اجتناب کیا کرتے تھے بلکہ عام محاورات کا استعمال وہ اپنے لیے معیوب جانتے تھے۔ عام فہم اشعار کہنے سے اسے کہیں زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے کہ ان کے طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں ایک جدت اور نرالا پن پایا جائے اور یہ کہنا کسی طرح غلط نہیں ہو کہ مرزا اُردو شاعری میں اپنے طرز کے موجد تھے۔ اوائل میں وہ بیدل کے

کلام سے بہت کچھ متاثر ہوئے تھے۔ موجودہ دیوان کی اکثر غزلوں میں بھی جا بجا اس کی شہادت ملتی ہے۔ اس دیوان میں اول سے آخر تک بے شمار ترکیبیں ایسی ملتی ہیں جو اُردو شعرا کی عام شاہراہ سے بالکل الگ ہیں اور جن میں بیدل کا رنگ صاف طور پر نمایاں ہے مثلاً۔ دام شنیدن، یک بیابان ماندگی، ماتم یک شہر آرزو، رستخیز اندازہ، بخون غلطیدۂ صد رنگ، نشہ ہا شادابِ رنگ، عرضِ نازِ، شوخیٔ دنداں، یک جہاں زانو تامل، رنگ تماشا باختن۔ اس قسم کی بندشوں کے علاوہ جو کثرت سے ملتی ہیں بعض پوری غزلیں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ قصداً بیدل کے رنگ میں لکھی گئی ہیں مثلاً:۔

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب ✤ دے بطِ مے کو۔ دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت۔ وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن ✤ سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز ✤ دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

یا مثلاً یہ غزل

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے ✤ دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل ✤ یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

قصائد میں بھی تقریباً یہی حال ہے چنانچہ قصیدہ اول و دوم اور خاصکر اُن کی تشبیب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بیدل کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مگر وہ مقتضائے طبیعت کے خلاف کچھ تو اس راہ کی دشوار گزار ہونے کی وجہ سے اور کچھ معترضوں کی

نکتہ چینیوں سے تنگ آکر رفتہ رفتہ اس روش کو چھوڑتے گئے اور اس کشمکش میں ایک ایسی معتدل روش کی بنیاد پڑ گئی جس کو خاص مرزا کی روش کہنا چاہیے۔

ان کے زمانہ میں ایک بڑا گروہ ان کی مشکل پسندی کے باعث ان کی شاعری کا قائل نہ تھا چنانچہ لوگوں کی مخالفت اور قدرنشناسی سے تنگ آکر مرزا نے بارہا مختلف پیرایوں میں اس کا اظہار کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

اس میں اپنے مخالفین کی طرف بھی اشارہ ہے اور ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں ان کی ناسمجھی پر چوٹ کی ہے۔ مندرجہ ذیل رباعی سے بھی اسی قسم کا مضمون مفہوم ہوتا ہے۔

رباعی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ✦ سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ✦ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اب ملک میں زبان فارسی کا رواج اس قدر کم ہوتا جاتا ہے کہ باوجود اس درجہ مقبولیت کے بھی غالب کے فارسی کلام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کی فارسی دیوان میں بھی وہ نایاب جواہر پوشیدہ ہیں جن کو بازار علم میں لایا جائے تو انمول ثابت ہوں گے۔ مرزا کو اپنے فارسی کلام پر فخر تھا اور اس کا ذکر انہوں نے متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں ؎

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے دلی کے سرمایۂ ناز کارنامے اور اُس کے رہے سہے فن و کمال یہانتک کہ اس کی تہذیب کو مٹانے اور برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مرزا جیسے باکمال شاعر اور صاحبدل پر اس کا اثر نہ ہوتا۔ چنانچہ جس پوشیدہ مگر دردناک پیرایہ میں اُنھوں نے اس کا مرثیہ لکھا وہ حقیقتاً دل ہلا دینے والا ہے اور ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رلواتا ہے۔ اس کے چند اشعار نقل کیے بغیر دل نہیں مانتا ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ٭ اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ٭ زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ٭ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط ٭ دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں ٭ نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ٭ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج ٭ قمری کا طوق۔ حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل۔ ہر فغاں کے ساتھ ٭ تارِ نفس۔ کمندِ شکارِ اثر۔ ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل ٭ سیلابِ گریہ۔ در پئے دیوار و در ہے آج

غالب کے دیوان میں جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ان کی حبِ وطن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ بار بار اپنے ملک کی بدنصیبی پر روتے ہیں۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا ‌ ‌ جاہ و جلال عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ
ہر داغ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے ‌ ‌ عرضِ فضائے سینۂ دردِ امتحاں نہ پوچھ

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

کس قدر معنی خیز و دردناک شعر ہے۔ اگر مرزا غالب کے دیوان کو بغور پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو اپنے ملک سے کس درجہ محبت ہے اپنے ضائع شدہ قومی وقار کا کس درجہ رنج ہے اور اپنی کھوئی ہوئی ملکی آزادی پر ان کے آنسو کبھی نہیں تھمتے۔ فرماتے ہیں ؎

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ‌ ‌ لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق ‌ ‌ میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اُس وقت ملک کی جو حالت تھی اسے یاد کر کے کہتے ہیں ؎

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

اور پھر اپنی ناچاری و مجبوری دیکھ کر صبر و شکر کی ہدایت کرتے ہیں ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالب ‌ ‌ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اپنی ملکی آزادی کے جانے پر ہر چند صبر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ضبط نہیں ہوتا اور بے اختیار چیخ اُٹھتے ہیں ؎

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے ‌ ‌ میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

اسی غزل میں ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ حکومت ہی اصل میں قوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔ اور جب کسی قوم کو حکومت حاصل ہوگئی تو گویا سب کچھ مل گیا اور اُس قوم میں زندگی آگئی ؎

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

جام کا اشارہ صاف سلطنت کی طرف ہے۔ ایک موقعہ پر اپنے ابنائے ملک کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم میں حب وطن کا سچا جوش ہے اور آزادی کی خواہش حقیقی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنا اثر نہ کرے حکومت و سلطنت کسی خاص شخص یا قوم کی ملکیت نہیں ہوا کرتی جیسا کہ جمشید کی خاتم اس کی خاص ملکیت تھی ؎

عشق تاثیر سے نومید نہیں — جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے — جام مے خاتم جمشید نہیں

خمار حب الوطنی آسانی سے نہیں اُترتا اور جب کسی قوم میں اس کا احساس ہوگیا تو اس جنون کو دور کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ اس مضمون کو مرزا غالب نے کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں — ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہنگامے کے بعد جو اعلان ہوا اُس میں کہا گیا کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کو رفتہ رفتہ دیجائے گی یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آگیا

جب حکومت کی ساری ذمہ داری اہل ہند کے سپرد کر دی جائے گی۔ مرزا غالب کہتے ہیں اور حسرت و مایوسی کے ساتھ کہتے ہیں ؎

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

اپنے درد دل کا اظہار نہ کرنا اور اپنے مصائب پر خاموش رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ قوم میں زندگی باقی نہیں ہے اور قوم مردہ ہو چکی ہے بلکہ ایسی خاموشی قوم کے مرگ کا باعث ہوتی ہے۔ اس خیال کو کس عمدگی سے اور کتنی اچھی اور خوبصورت تشبیہ کے ساتھ مرزا نے ادا کیا ہے ؎

زبانِ اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

اس زمانہ میں جو حالات تھے اس کے اعتبار سے صاف صاف الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کرنے سے وہ معذور تھے اور مجبوراً ایسے خیالات کا اظہار نہایت گہرے اور پوشیدہ مضمون ہی میں کر سکتے تھے ؎

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے — اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آئے

ایک اور جگہ جتایا ہے ؎

گر خامشی میں فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

مرزا غالب کے اشعار میں عموماً کئی کئی معنی نکالے جا سکتے ہیں جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

علاوہ حُسنِ معنی کے اُن کے اشعار ایک وجدانی کیفیت پیدا کرتے ہیں جس کا لطف کچھ وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو اہلِ دل اور صاحبِ ذوق ہیں۔

شاعر کے لیے کچھ یہ ضروری نہیں ہے کہ شعر کہتے وقت اُس کے ذہن میں وہ تمام معنی و مضامین موجود ہوں جو اُس کے خیال کی پرواز، الفاظ کی بندش، وغیرہم کے باعث متاخرین پیدا کر سکیں غالب کے دیوان کو اُٹھا لو اور دیکھو کہ اس کے اشعار ہر زمانہ ہر آب و ہوا اور ہر طبیعت کی مطابقت کرتے ہیں یا نہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے ختم ہونے پر جب عام معافی کا اعلان ہو گیا تو مرزا غالب نے ایک زبردست فارسی قصیدہ لکھا تھا جو فنِ شاعری اور قادر الکلامی کا ایک گراں بہا اور نادر الوجود نمونہ ہے جس کے بعض حصے مولانا حالی نے بھی یادگارِ غالب میں نقل کیے ہیں۔ اس قصیدہ کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اُس سے ہماری گزشتہ بیان کی پوری طرح پر تائید ہوتی ہے ناظرین کی صرف ادبی دلچسپی کی غرض سے چند شعر اس عجیب و غریب قصیدہ کے نقل کرتا ہوں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قریباً ہر شعر میں سیاسی پہلو نمایاں ہے۔

در روزگار ہا نتوانند شمار یافت — خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
پرکار تیز گردِ فلک در میاں مبیں — حق داد دادِ حق کہ نہ ہرگز قرار یافت
آمد اگر بفرض ز بالا بلا فرود — بر روے خاک پیچ و خمِ زلفِ یار یافت
در خاک و باد و آتش و آب آشتی فزود — ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
ناچار جز بداد گرایش نمی کند — در دہر ہر چہ صورت ازیں ہر چہار یافت
گر خواجہ بندہ را خطِ آزادگی نوشت — ہم بر درِ سرائے خودش بندہ وار یافت
در بندہ خود ز خشم خطِ بندگی درید — توقیعِ خوشدلی ز خداوندگار یافت

رہزن متاع خویش برابن السبیل بخت　　　کودک رضائے لہو ز آموزگار یافت

ہندو مسلمانوں کے اتفاق کا جو غلغلہ آج کل مچا ہوا ہے اور ایک دوسرے کو اپنا ہمدرد بھائی بنانے پر تلا ہے اور سارے اختلافات مٹانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں یہاں تک کہ مسلمانوں کے خاص مذہبی معاملات میں بھی ہندوؤں نے عملی ہمدردی کا اظہار شروع کر دیا ہے مرزا غالب نے اس ضرورت کو بہت پہلے محسوس کیا تھا اور مسلمانوں سے گویا وہ یہ کہتے ہیں ؎

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

غالب بیشک انسانی ہستی کا اعلیٰ مفسر ہے اور اس کا کلام ہر زمانہ میں انسان کے دلی جذبات و خیالات کی تعبیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہے گا۔ اس ہائیمبر کی رائے میں غالب شیلی کی پرواز کیٹس کی فصاحت گوئٹے کی عمیق النظری شلر کی بلند خیالی۔ فرنسس ٹامسن کے تخیل۔ مومن کے درد سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی کا مجموعہ ہے۔

"میرا قلب آرزو مند ہے کہ تیرے نغموں کا ہم نوا ہو جائے لیکن ایک آواز کے لیے بیکار تڑپ رہا ہے۔ میں بولتا ہوں لیکن بول نغمہ نہیں بنتے۔ لاچار عاجز ہو کر چیخ اٹھتا ہوں" (ٹیگور)

خلاصہ یہ کہ مرزا کی شاعری میں ہزارہا نکتے ایسے پائے جاتے ہیں جو ناقابل بیان ہیں ان کے اشعار کو پڑھ کر جو حالتیں یا کیفیتیں طاری ہوتی ہیں ان کو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کرنا ناممکن ہے بقول خواجہ حافظ شیرازی ؎

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد　　　کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگار یست

خاکسار محمود از دہلی۔ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

ھوالمستعان

دیباچہ طبع ثانی

سید راس مسعود صاحب کی تحریک پر دیوان غالب کا خاص ایڈیشن نظامی پریس سے ۱۹۱۵ء میں نکالا تھا - یہ وہ زمانہ تھا کہ سوءِ اتفاق سے یہ خاکسار کئی ماہ تک بستر علالت پر پڑا رہا اور اس وجہ سے اس کی کاپیوں کی صحت کا کام دوسروں کے ہاتھ میں رہا اور یہ ادعا کہ وہ غلطیوں سے پاک ہو غلط ہو گیا جیسا کہ اس معذرت نامے سے جو اس ایڈیشن کے آخر میں لکھنا پڑا ظاہر ہے - لیکن پھر بھی وہ ایڈیشن بازار میں دستیاب ہونے والے نسخوں سے کیا بہ لحاظ اپنی دلفریبیوں اور کیا بہ لحاظ صحت بسا غنیمت تھا - یہی وجہ ہوئی کہ شائقین کلام غالب نے میری توقع سے زیادہ اس کی قدر فرمائی - اس ایڈیشن کے خریداروں میں فی صدی ۹۰ - انگریزی داں اصحاب شامل ہیں جن میں زیادہ تعداد گریجوئیٹ وکلاء و بیرسٹر صاحبان کی ہے - اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے حلقے میں دیوان غالب کے پہلے ایڈیشن کو ہر دلعزیز بنانے میں محض اس کی ظاہری خوش نمائی ہی محرک نہیں ہوئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ صرف غالب کا کلام ہی وہ کلام ہے جو متصوفانہ مذاق کے ساتھ فلسفی مسائل سے بھی مالامال ہے - غالب کا تخیل وہ چیز ہے جو کبھی پرانا نہیں ہو سکتا - یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ اشخاص کی طبیعتوں کا رجحان غالب کی طرف بڑھتا ہوا ہے - غالب کو اپنی زندگی میں جب

کہ اس کے معاصرین اس کے طرزِ کلام پر صرف اس وجہ سے مضحکہ اُڑاتے تھے کہ اُس نے شاعری کی ایک جدید شاہ راہ قائم کی تھی اور عشق و عاشقی اور گل و بلبل کے پارینہ مضامین سے اس کا مطمح نظر کہیں بلند تھا۔ کیا خبر تھی کہ اس کے مرنے سے تقریباً نصف صدی بعد وہ خوبیاں جو اس نے اپنی شاعری میں سب سے علحدہ ہو کر پیدا کی تھیں عام طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سب سے پہلے غالب نے یہ ثابت کر دیا کہ اُردو نظم میں ہر طرح کی فصاحت و بلاغت فلسفہ و حکمت اور نیچرل جذبات کے ادا کرنے کی قابلیت موجود ہے۔ غالب نے شاعری کے مقصد کو خوب پہچانا ہے وہ صرف غزل سرائی سے غیر مہذب جذبات کو اُبھارنا پسند نہیں کرتا تھا بلکہ اُس نے وہ روش اور اسلوب بیان اختیار کیا تھا جس سے وہ ایسے حکیمانہ خیالات دنیا کے سامنے پیش کر سکے جو دوسروں کی اصلاح کا باعث ہوں اور انسانی اخلاق کا پایا بلند ہو یہی وجہ ہے کہ بعض انگریزی تذکرہ نویس اُس کو یورپین مصنفین کا ہم پلہ سمجھتے ہیں۔ غالباً یہاں پر یہ اعتراض کیا جائیگا کہ ایک شخص جو رند مشرب ہو وہ دوسروں کی اصلاح کیا کر سکتا ہے۔

بیشک غالب ایک قابل ترک عادت میں مبتلا ہو گیا تھا لیکن وہ نہایت صداقت شعار اور راست گو تھا اُس نے اپنے کلام میں اپنی اس مذموم عادت پر جا بجا ملامت کی ہے اور اس لیے اُس کا کیرکٹر ریاکار زاہدوں اور نمائشی پرہیزگاروں سے بدرجہا قابل تعریف تھا۔ بہرحال اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے کلام میں توحید، تصوف، حکمت۔ فلسفہ۔ عبرت بے ثباتی دنیا

میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھکو ناز ہے کوئی اُن کا لطف نہیں اٹھاتا۔"
اُس زمانے کے خیال کے مطابق مرزا غالب اُردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اُس میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں ذوق کی طرف خطاب ہے کہتے ہیں ؎

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ ؛ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است
راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید ؛ ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگِ من است

ان اشعار میں اپنے فارسی گوئی کے جوشِ کمال میں مجموعۂ اُردو کو اپنے لیے موجبِ ننگ بتایا ہے ورنہ حقیقت میں اُن کا دیوانِ ریختہ "کم از گلشنِ کشمیر نہیں" کی نفیس اور پاکیزہ تشبیہ سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔

مرزا کے اچھوتے خیال۔ ان کی بلند پروازی اور تعمقِ مضامین کی مثال میں یہاں ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

کیا نفیس اور نرالا خیال ہے۔ زندگی کا لطف اسی لیے ہے کہ لوگوں کو مرنے کا یقین ہے ورنہ دنیا کا کوئی کام بھی انسان کی سُستی اور کاہلی کے باعث نہ ہوتا ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اگر انسان کا وجود نہ ہوتا تو وہ خدا ہوتا پہلے مصرعہ میں کہہ چکے ہیں کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ؎

آتا ہی داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

کیا شوخی ہی۔ در پردہ خدا سے شکایت کرتا ہی گو بظاہر درخواست ہی کہ میرے بے شمار گناہوں کا حساب مجھ سے نہ طلب کر ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

علوِ خیال قابلِ لاحظہ ہی۔ دوزخ و بہشت کا خیال عشقِ حقیقی میں حارج ہوتا ہی اور ایسی طاعت اور ایسا سجدہ نیاز لاحاصل ہی جس میں دوزخ کا خوف اور بہشت کی حرص و ہوس ہو۔

؎
ہی غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہی
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہی کس حساب میں

جو لوگ تصوف کا مذاق رکھتے ہیں اور مصطلحاتِ تصوف سے بھی واقف ہیں کچھ وہی لوگ اس شعر کا لطف اٹھا سکتے ہیں ؎

ہی پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

---

۱ حضرت آسی فرماتے ہیں ؎ تیرے کوچہ میں جسے ہو ہوسِ حور و قصور * کس تنعّم میں اسے حرص و ہوا لے بھیجا

۲ حضرت آسی سکندر پوری نے بھی اس مضمون کو نہایت عمدہ پیرایہ میں ادا کیا ہی ؎

ناظر و جلوہ و منظر نہ جب اک ہو جائے * کیا مزا روزِ قیامت میں ندامت کے سوا

کیا بلند مرتبہ ہے اور کتنی منزلیں طے کر چکے ہیں جس جگہ اوروں کا مذہب انتہا کو پہنچتا ہے وہاں سے حضرت غالب کا مذہب شروع ہوتا ہے ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

نئی نئی اور عجیب و غریب تشبیہیں اختراع کرنا کچھ انھیں کا کام تھا ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

استعارات و کنایات میں بھی جو شاعری کے لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں حضرت کو یدطولیٰ حاصل تھا قطرہ اپنی اصل یعنی بحر سے جدا ہوا ہے اور قبل اس کے کہ وہ پھر بحر میں مل جائے معلوم نہیں کیا کیا منازل اس کو طے کرنے ہیں اسے مسئلہ تناسخ سمجھو یا مشربِ صوفیہ۔

؎ رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

کیا سادگی ہے اور رازِ حقیقت کا کیا ہی انوکھا انکشاف ہے ؎

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

انسانی ہستی کا جزوِ اعظم محبت و عشق ہے اور انسان کے لیے محبت کا ہونا لازمی بتاتے ہیں خواہ وہ محبت ملکی ہو یا قومی حقیقی ہو یا مجازی اس مطلب کو کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ذوقؔ کو یہ شعر نہایت پسند تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے اشعار کی خود خبر نہیں ہوتی۔

بڑے بڑے فلسفی اپنے دقیق مسائل کا جواب اس الہامی کتاب دیوانِ غالب سے تلاش کر سکتے ہیں۔ فلسفہ کا غالباً سب سے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ وجہ آفرینشِ دنیا کیا ہے۔ ہر فلسفی نے اس کا جواب اپنی بساط کے موافق دیا ہے مرزا غالب اس کا جواب یوں دیتے ہیں

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں[1]
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

کس خوبی کے ساتھ ان دو مصرعوں میں مرزا نے اس مسئلہ کا حل کیا ہے مدارِ عالم حسن ہے اور حسن اظہار کا متقاضی ہے اس لیے دنیا عدم سے وجود میں آئی۔

عذرِ شراب خواری میں حضرت کا ایک شعر حقیقت میں ایک دفترِ معنی ہے اور جتنا اسے پڑھیے لطف اتنا ہی دوبالا ہوتا ہے یورپ کے نامور شعرا[2] کے کلام

---

[1] اسی مضمون کو حضرت آسی غازی پوری نے بھی نہایت خوبی سے ادا کیا ہے
حسن پھر کس کام کا جب چاہنے والا نہ ہو۔ سچ ہے تجھ سے ولربا کو لطفِ تنہائی نہ تھا

[2] غالب کے سمجھنے میں مجھے جو مدد ایک عرصہ سے اپنے عزیز دوست مسٹر عبدالمجید خواجہ ایم اے (کینٹب) بیرسٹر ایٹ لا سے (جو خود بھی شاعر ہیں) ملتی رہی ہے اس کا اظہار اس جگہ شاید

راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں لیکن اس موضوع پر اس پایہ کا ایک شعر بھی
نہیں ملا۔ اسے صوفیائے کرام کے مسلک کی تشریح کہیے یا جو چاہے سمجھ لیجیے
کیونکہ اس کی کیفیت الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

اہل تصوف اگر اس جام جہاں نمائینی دیوان غالب میں اپنا عکس دیکھنا
چاہیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ ان کے تمام دقیق مسائل کا کس خوبی کے ساتھ
اس شیخ نے حل کیا ہے کیا شعر ہیں اور کن رموز فطرت کا اظہار ہے ؎

اک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا — یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا
آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیش نظر ہے آئنہ دایم نقاب میں

غالب کا مذہب قیود اور پابندیوں سے پاک ہے وہ اس منزل پر ہیں کہ جہاں
ہندو مسلمان کی تمیز باقی نہیں رہتی ؎

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

مغربی تہذیب کے والہ و شیدا اکثر فرماتے ہیں کہ غالب میں سوا گل و بلبل
کے افسانوں کے اور کیا رکھا ہے۔

بے موقع نہ ہو۔ اگر غالب کی عظمت کو ایک ذرہ برابر بھی صحیح طور پر اس حقیر نے سمجھا ہے تو یہ انہیں کے
فیض صحبت کا اثر ہے۔ میں اپنے دوست کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی بدولت اس ناچیز
کی چشم کور نے روشنی کی شعاعیں دیکھیں ۱۲ محمود

ان کے دل حسن و حقیقت سے نا آشنا۔ ان کے دماغ جذباتی کیفیات سے بے بہرہ۔ بھلا وہ ان رموز کو کیا سمجھیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے مرزا غالب نے لکھا ہے۔

مطلب ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کاش غالب کو بھی کوئی فٹز جیرالڈ[۱] ملجاتا جو اُس کے کلام کے رموز و نکات کو کسی مغربی زبان میں اہل مغرب کے سامنے پیش کرتا۔

اس بارِ عظیم کا بیڑا اگر مسز سروجنی نائیڈو جو خود بھی معرفت الٰہی کی مطربۂ نغمہ سرا ہیں اُٹھائیں تو کیا عجب کہ اُسے کچھ کامیابی ہو جائے۔

غالب کے کلام کی یہ عظمت اُس کے تخیل و ادراک کا وہ عالم۔ مگر افسوس غالب کا مزار دلی میں جس حالت میں پڑا ہوا ہے اُسے دیکھ کر ایک فلسفی کا قول یاد آتا ہے جس نے کہا تھا کہ اگر تم کو کسی قوم کی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو تم اُس کے مزارات پر چلے جاؤ۔ غالب کے مزار پر جاکر جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ مجھے ویمیر میں گوئٹے[۲] کے مزار کے

---

۱ یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے عمر خیام کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور خوبی ترجمہ کے باعث عمر خیام کا نام آج یورپ میں روشن ہے۔ ۲ گوئٹے جرمنی کا سب سے زیادہ مشہور شاعر گزرا ہے جس کا زمانہ ۱۷۴۹ء سے ۱۸۳۲ء تک تھا اس کا معرکۃ الآرا ڈراما فاسٹ ہے ۳ وہ شہر ویمیر میں رہتا تھا اور وہیں دفن ہے۔

دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ ایک وہاں کی قدردانی ہے اور ایک یہاں کی کس مپرسی
دونوں کا فرق دیکھ کر اقبال کا مشہور شعر جو اس نے غالباً ایسی ہی کیفیت
سے متاثر ہو کر لکھا ہوگا بے اختیار میری زبان پر جاری ہو گیا ؎

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ بحیثیت ایک قوم کے ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے
سے پہلے ہو چکا تھا۔ اور اس وقت کے شعرا اور صاحبان سیاست
دونوں نے اسے محسوس کیا۔ اہل سیاست کے احساس کا نتیجہ ہنگامہ
ہوا اور شعرا نے مختلف طریقوں سے اس پر نوحہ کیا۔ مرزا غالب کا احساس
گہرا تھا اور انھوں نے نہایت پردرد پیرایہ میں اس کا اظہار کیا ہے ؎

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے — لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

پھر کہتے ہیں: ؎

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دلی اور نواح دلی پر جو آفتیں ٹوٹیں انھوں نے
ہزارہا بندگان خدا کو بے خانماں کر دیا۔ شہزادے اور شہزادیاں جنگلوں میں
مارے مارے پھرتے تھے۔ دلی اجڑ گئی اور شرفا کے مکان ویران و برباد کر دئے
گئے۔ ان واقعات کو مرزا نے بچشم خود دیکھا تھا۔ غالباً اسی کے متعلق فرماتے

ہیں ؎

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہی مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

جو مصائب اہل ہند پر ۱۸۵۷ء کے کچھ پہلے اور پھر اس کے بعد نازل ہوئے وہ بجائے خود آئندہ کے لیے ایک سبق تھے جس کو مرزا نے کس خوبی سے ادا کیا ہی اور ان کی خواہش ہی کہ ان کے ہم وطن اس سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لیے متنبہ ہوں ؎

اہل بینش کو ہی طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج۔ کم از سیلیٔ اُستاد نہیں

دلّی فتح ہونے کے بعد نہ صرف اہل دلّی نے بلکہ تقریباً تمام ملک نے انگریزی سرکار کی اطاعت قبول کر لی اور طرح طرح سے اپنی وفاداری کا اظہار کرنے لگے۔ لیکن حکام انگریزی کا جوش انتقام کم نہ ہوا ہنگامے کے حالات اُن کو فراموش نہ ہوئے۔ لوگوں کو سزائیں دی گئیں۔ امرا کی جاگیریں ضبط ہوئیں۔ غربا کے مکانات مسمار کر دیے گئے۔ مرزا اس کا ذکر شکایت کے پیرایہ میں یوں کرتے ہیں ؎

وائے محرومیٔ تسلیم۔ و بدا حال وفا
جانتا ہی کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

اور سزا کی سختی کی یوں شکایت کرتے ہیں ؎

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں۔ کافر نہیں ہوں میں

خودداری۔ استغنا۔ اور اسی قسم کے اخلاقی مضامین بکثرت پائے جاتے ہیں۔ غالب نے ان مضامین پر کبھی فخر نہیں کیا بلکہ اپنے رندانہ مشرب کی وجہ سے جہاں کہیں اس قسم کے مضامین پر قلم اٹھانے کا ذکر کیا ہی تو انفعال کے ساتھ کہتا ہی ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ ‌‌ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اردو شاعری میں تو غالب کا خاص مرتبہ تھا ہی، فارسی میں بھی اس کا پایہ کسی اہل زبان شاعر سے کم نہیں ہی۔ اس اردو دیوان کے دیباچہ میں اس کی فارسی شاعری سے بحث کرنا ہمارے منصب سے باہر ہی۔ اس موقعے پر ہمیں صرف یہ کہنا ہی کہ اپنے اردو کلام میں جو مضامین غالب نے ادا کیے ہیں وہ معنی خیزی کے لحاظ سے فارسی اشعار سے کسی طور پر کم نہیں ہیں بلکہ بعض حالتوں میں وہ فارسی سے بھی زیادہ ممتاز ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کے اردو کلام میں جابجا فارسی کے پیوند لگائے گئے ہیں جس کی وجہ سے وہ مشکل اور دقیق سمجھا جاتا ہی۔ لیکن جب وہ اس روش کو چھوڑ کر صفائی اور سادگی کی طرف جاتا ہی تو ظاہر ہوتا ہی کہ وہ سادگی بیان پر جو قدرت رکھتا ہی وہ دوسرے شاعر کو بہت کم حاصل ہی اس کے دقیق اشعار اور فارسیت کے رنگ نے یہ ضرورت پیدا کر دی ہی کہ اس کے مطالب کو عام فہم اور آسان بنانے کے لیے دیوان کی شرح لکھی جائے۔ چنانچہ اس وقت تک کئی شرحیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ موجودہ شرحیں دلدادگان کلام غالب کی ضرورت کو پورا کرتی ہیں اور اس وجہ سے ہم نے اپنے پہلے ایڈیشن کو صرف شائع کرنا کافی سمجھا تھا۔ اس ایڈیشن میں صرف اشارات

املائی کے استعمال سے مشکل اشعار کو اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ پڑھنے کے ساتھ ہی ناظرین کے ذہن میں اُتر جائیں لیکن اکثر احباب نے ہمیں مجبور کیا اور یہ مشورہ دیا کہ دوسرے اڈیشن میں مشکل الفاظ کے معنی عام فہم اردو میں اور دقیق مضامین کی شرح مختصر طریقے سے بطور حاشیہ ہر صفحہ پر متن کے تحت میں لکھ دی جائے تاکہ ناظرین کو کسی دوسری شرح کے سامنے رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ حاشیے کے لکھنے میں ہم نے شرح طباطبائی، شرح مولانا حسرت اور خود رقعات غالب کو جو عود ہندی میں موجود ہیں پیش نظر رکھا ہے۔ حضرت شوکت میرٹھی کی شرح دیکھنے کا بھی اس اثنا میں موقع ملا۔ اس شرح میں اگرچہ مکمل دیوان نقل نہیں کیا گیا ہے لیکن جن اشعار کی شرح دی گئی ہے ان میں سے اکثر میں عام دیوانوں کے خلاف تصرف کرکے کلام غالب کی وہ گت بنائی ہے کہ جس سے گوشۂ قبر میں غالب کی روح کو ضرور کوفت ہوتی ہوگی مثلاً تمام نسخوں میں یہ لکھا ہے ؎

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھدے ٭ کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

شوکت صاحب اصلاح فرماتے ہیں ؎

نہ دے نالہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے ٭ کہ حیرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جُدائی کا

اس طرح کے محرفہ اشعار شوکت صاحب کی شرح میں اکثر ملتے ہیں۔ اگر حضرت شوکت کسی قدیم نسخۂ دیوان کا حوالہ دیتے اور اسکی بنا پر اشعار کی تصحیح کرتے تو حق بجانب تھا۔ عام مطبوعہ دیوانوں میں بھی بعض بعض اشعار میں اختلاف پایا جاتا ہے اسی وجہ سے ہمیں چند اڈیشن مختلف مطابع کے چھپے ہوئے تصحیح کی غرض سے جمع کرنا پڑے۔ پہلے اڈیشن کی اشاعت کے وقت سب سے زیادہ قدیم چھپا ہوا

وہ نسخہ دستیاب ہوا تھا جو مطبع احمدی دہلی سے ۱۲۷۸ھ میں شائع ہوا تھا اور جس کی کاپیوں کی صحت خود مرزا نے کی تھی۔ اس مرتبہ اس سے زیادہ پرانا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا جو اُس اصل دیوان سے نقل کیا گیا ہی جس کو پہلی مرتبہ غالب نے ۱۲۴۸ھ میں مرتب کیا تھا یہ نقل بھی جو ہمیں دستیاب ہوئی ہی اُسی زمانہ کی لکھی ہوئی ہی۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ بزبان فارسی مصنف نے لکھا ہی جس کو ناظرین کے مطالعہ کے لیے اس دیوان کے شروع میں بجنسہ درج کیا گیا ہی اس دیباچہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ دیوان اُردو فارسی دیوان سے پہلے مصنف نے ۱۲۴۸ھ میں ترتیب دیا لیکن اس میں مصنف کی بعض مشہور غزلیں نہیں ہیں ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ۱۲۴۸ھ کے بعد دوسرا نسخہ مرزا نے اُن غزلیات کو شامل کرکے جو سال مذکور کے بعد تصنیف ہوئیں ترتیب دیا ہی اور وہی اب تک رائج ہی اگر اُس قلمی نسخے کی جو ۱۲۴۸ھ کا لکھا ہوا ہمیں ملا ہی متابعت کی جائے تو بعض مشہور غزلیں نکال دینا پڑینگی۔ مثلاً یہ غزل " لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور " جس کا مضمون تاریخی واقعہ پر مشتمل ہی اور جو یقیناً غالب کی مصنفہ ہی، اس لیے اس قلمی دیوان سے صرف یہ مدد لی گئی ہی کہ بعض خفیف غلطیاں جو مطبوعہ دیوانوں میں پائی گئیں درست کرلی گئی ہیں۔ موجودہ ایڈیشن میں حتی الامکان کتابت کی غلطیوں کی صحت کی گئی ہی۔ لیکن پھر بھی ممکن ہی کہ بعض متجسس اور نکتہ چیں نگاہیں کاتب کے کسی نہ کسی سہو کو ڈھونڈھ نکالیں۔ نہایت سختی کے ساتھ کتابت میں اُملا کا خیال رکھا گیا ہی جو زمانۂ حال میں سررشتۂ تعلیم کی

کتابوں میں مروج ہی اور جس سے اردو کتابت کا یہ نقص دور ہو جاتا ہی کہ اُس میں مختلف آوازوں کو ایک ہی صورت میں لکھا جاتا ہی مثلاً گھُر۔ گھِر۔ گھرنے۔ فی۔ اور فیِ وغیرہ جہانتک سعنی نے اجازت دی ہی مرکب لفظوں کو علیحدہ کر کے لکھا گیا ہی۔ کسی ایسے لفظ کو جو دو لفظوں سے مل کر بنا ہی ملا کر لکھنے سے احتراز کیا گیا ہی اور دو لفظوں کو جو جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں قطعی طور پر ملانا جائز نہیں رکھا ہی مثلاً "کش مکش" کو بصورت "کشمکش" نہیں لکھا ہی۔

اس طرز تحریر کے اختیار کرنے سے صرف یہ مقصد ہی کہ اُردو رسم الخط سریع الفہم صورت اختیار کرنے اور یہ بھی خیال رکھا ہی کہ لفظ کی صورت آواز سے مطابقت کرے مثلاً "نہ دے نامے کو اتنا طول" الخ اس طریقہ سے نہیں لکھا "نہ دے نامہ کو اتنا طول" الخ۔ اشارات املائی میں بھی اس مرتبہ زیادہ صحت کا خیال رکھا گیا ہی چونکہ اُردو میں اس وقت تک اشارات املائی کی صورتیں مخصوص نہیں اس لیے ہم نے انگریزی اشارات کا اتباع کیا ہی۔ البتہ اس قدر تصرف کیا ہی کہ کامے کی جگہ خفیف ڈیش سے کام لیا ہی پہلے ایڈیشن میں مرزا کا صرف فوٹو دیا گیا تھا اس مرتبہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط حاصل کر کے اس کا عکس بھی چھاپا گیا ہی جس کے لیے ہم قاضی محمد خلیل[1] صاحب رئیس بریلی کے شکر گزار ہیں۔ یہ خط قاضی صاحب موصوف کے پاس محفوظ تھا۔ مولوی وہاب الدین[2] صاحب طالب نشتوری

---

[1] قاضی صاحب قاضی عبدالجمیل صاحب جمیل بریلوی کے جو مرزا صاحب کے ارشد تلامذہ میں تھے جن کے نام غالب کے مطبوعہ خطوط عود ہندی میں موجود ہیں خلف الصدق ہیں۔

[2] مولوی صاحب مولوی عزیز الدین صاحب بدایونی کے جو غالب کے شاگرد رشید تھے خلف الرشید ہیں۔

بدایونی کے ذریعہ ہم تک پہونچا جس کے لیے مولوی صاحب موصوف بھی مستحق شکریہ ہیں۔

اُمید ہی کہ اُردو ادب کی یہ خدمت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اُردو دیوان غالب کا یہ دوسرا ایڈیشن فی الواقع ترقی ادب اردو کی اس اسکیم کی جو عالی جناب سید راس مسعود صاحب بی اے آکسن ناظم تعلیمات سرکار نظام خلد اللہ ملکہ کے عرصے تک زیر غور رہی ہی پہلی قسط ہی۔ خدا سے دعا ہی کہ ہماری یہ کوشش مقبولِ انام ہو تاکہ آئندہ ہمیں ہمت ہو کہ اس سلسلے میں اُردو کے دوسرے قدیم اساتذہ کا کلام اسی طریقے سے شائع کر سکیں۔ اور ہماری یہ مطبوعات نفاست پسند علم دوست تعلیم یافتہ اصحاب کے کتب خانوں کی زینت ہو کر مصنفین کے نام کو جنھوں نے اُردو کی خدمت میں اپنی عمریں صرف کر دی ہیں زندہ اور قایم رکھ سکیں

خاکسار

نظامی عفی عنہٗ

بدایوں۔ ۲۰؍ جون سنہ ۱۹۱۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

دیباچہ طبع اوّل

زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد
شد آں مرغ، کو بیضۂ زریں نہاد

"یادش بخیر! وہ زمانہ بھی کیا زمانہ ہوگا جب کہ ایشیائی علوم و فنون کے چشمے جزیرہ نمائے ہند کے گھر گھر میں اُبل رہے ہوں گے"۔ تیمور سے پہلے اور اُس کے بعد جب جب مسلمان فاتحین نے ہندوستان پر فاتحانہ حملے کیے ہیں۔ اُس وقت کس کو یقین ہوگا، کہ یہ آریہ ورت کا دیس ان بدیسیوں کی بدولت اپنی عالی شان و شوکت اپنی کامل عظمت و جلالت، اپنی اتم لیاقت و علمیت کے لحاظ سے عہد خلفائے عباسیہ کا ہم عہد ہوگا۔ یہی وہ مبارک زمانہ تھا جب کہ فاتح قوم کے ساتھ تمام مفتوح اقوام بھی قدم بہ قدم ترقی کے میدانوں کو طے کرتی

نظر آتی تھیں جب حکمران کو جن علوم و فنون کے کُملاء و ماہرین کی تلاش ہوتی تھی نگاہ التفات کے ایک معمولی سے اشارے پر ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں ور دولت پر حاضر ہو جاتے تھے۔ قطب الدین ایبک سے مرحوم بہادر شاہ ظفر تک کے درباروں پر نظر ڈالی جائے، کوئی دربار ایسا نظر نہ آئے گا جس کے میر فروشوں میں منتخبین روزگار کے مجسّمے لازمۂ زینت و زیبائش نہ ہوں۔

جس زمانہ کی یہ حالت ہو اُس زمانے کی دلچسپیوں اور مشاغل کا کیا پوچھنا۔ سستا سماں، نے فکری کا زمانہ، سلطنت قدرداں، خود قابل، ان صورتوں میں جو مشغلے ہوں گے غالباً مفید اور علمی ہی ہوں گے یہ مسلم ہے کہ کوئی مشغلہ بغیر تحریص و تقابل ترقی پذیر نہیں ہوتا۔ اور تحریص و تقابل کے لیے سوسائٹی کا ہم خیال و ہم لیاقت ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ اُس زمانے میں ہم لیاقتی و ہم خیالی کی کمی نہ تھی۔ جہاں کسی نے ایک خیال کو عملی جامہ پہنایا چراغ سے چراغ جلنے لگا۔

دیگر علوم و فنون کی طرح شاعری کا ستارہ بھی کچھ کم عروج پر نہ تھا شاعروں کے منہ موتیوں سے بھرے جاتے تھے۔ سخن سنجوں کا کلام زر و جواہر میں تولا جاتا تھا۔ فرد فرد پر اشرفی صلے میں ملتی تھی۔ اور پھر جاگیرات و مناصب مستزاد۔ ان ترقیوں اور قدردانیوں کے نظارے ایک دو سال نہیں بلکہ چند در چند صدیوں تک دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتے رہے۔ مگر تیرھویں صدی ہجری کے آخر تک اُس عروج کے سارے مدارج

طے کر کے ترقی معکوس کی گردان شروع کر دی اور گویا چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی
اُن باکمالوں کی مجلسوں اور مجمعوں کا پتا نہ چلا جو بغیر سعی و کاوش ہر وقت اور ہر جگہ
پیش نظر تھے۔ البتہ مجلسوں اور مجمعوں کی جگمگاتی خال خال کوئی صاحبِ کمال نظر آجاتا تھا
مگر آہ اور صد آہ کہ آج وہ حقیقی قحط الرجال ہے کہ بجز نام باد رہ جانے کے ان باکمالوں
میں سے کسی ایک فرد کا نشان نہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ؎

پیش ازیں بر رفتگاں افسوس می خوردند خلق
می خورند افسوس در ایامِ ما بر ماندگاں

تیرھویں صدی کی آخری نمود اُس باکمال شاعر پر ختم ہو گئی جس کو علی الکُل
غالب کہنا ذرا بھی مبالغہ نہیں یعنی نجم الدولہ میرزا اسد اللہ خاں غالب
(جن کا پرانا دیوان نئے سامان کے ساتھ ان چند سطروں کے بعد پیش نظر ہوگا)
اُن باکمال اور فطرت شناس شعرا میں تھے جن کی سچّی تعریف کے لیے فی زمانا
ہم جیسے نااہلوں کو اس مشہور شعر کے پڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ؎

سعدیا ثنائے تو نہ تواند بشرح گفت
خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تُست

مرزا غالب کی شاعری کے مدارج کو پہونچنا اور اُن کے اصلی مفہوم کو سمجھنا
کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اُردو شعرا میں وہی ایک اور صرف وہی ایک
ایسے مختص النوع اور مخترع الطبیعۃ فردِ فرید گزرے ہیں جن کی ہر بات میں
جدت ہر رنگ میں ندرت۔ ہر تخیل میں فوقیت نظر آتی ہے۔ اگرچہ اُن کی شاعری بھی بلحاظ
اصول و قواعد کوئی نئی شاعری نہیں ہے۔ اصنافِ سخن کی وہی قسمیں اور اُن میں وہی پابندیاں

نظر آتی ہیں جن کی ابتدا ولی نے اور ترمیم و اصلاح میر نے کی ہے۔ بایں ہمہ اُن کا کوئی
قصیدہ کوئی مثنوی کوئی قطعہ کوئی غزل کوئی رباعی حتیٰ کہ ایک فرد بھی ایسی نہ ملے گی جو
اپنے علوِ تخیل۔ رفعتِ مضمون۔ موزوں۔ اسالیبِ تخصیصِ ترکیب اور دل آویز ادا میں
تمام اساتذۂ سلف و خلف کے کلام سے جداگانہ شان نہ رکھتی ہو ان کے ممتاز کلام
کی ایک ادنیٰ سی شناخت یہ ہے کہ جب کوئی شعر اُن کا پڑھا جاتا ہے تو بغیر اس کے
کہ نام یا تخلص معلوم ہو سننے والا جس کا مذاقِ سخن صحیح ہے بے تکلف سمجھ جاتا ہے کہ یہ
مرزا غالب کا شعر ہے۔ یہی حیثیتِ ممیزہ بتاتی ہے کہ اُن کے زمانے میں بعض اہلِ
سخن بوجہ اجنبیتِ روش معاصرانہ لاگ سے اُن کے کلام کو ناپسند کرتے تھے
حتیٰ کہ اس معاندانہ خیال کا اثر اب تک یہ باقی ہے کہ جہاں ایسے لوگوں میں کوئی
شعر فارسی اور اجنبی ترکیب و اضافت کا پڑھا یا سنا جاتا ہے بے تکان کہہ دیا
جاتا ہے کہ یہ مرزا غالب کا رنگ ہے۔ حالانکہ یہ خیال واقعیت سے کوسوں دور ہے۔

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

انہیں خیالات سے مجبور ہو کر جا بجا مرزا مرحوم نے کہا ہے ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ؛ سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ؛ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ظاہر ہے کہ آج نہ مرزا غالب زندہ ہیں نہ اُن کے معاصرین اور قدر دان
موجود ہیں نہ وہ قابلیت و فن دانی باقی ہے مگر اس نئی اور مغربی دنیا کی روشنی
میں ایک پرانے اور ایشیائی شاعر کے موتیوں کی چمک غالب

نظر آتی ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اگر مرزا غالب شعرا کی طرح حلقہ متصوفین میں بھی شامل ہوتے تو آج اُن کے قطعے کو ملفوظات کرامت میں شامل کیا جاتا جو اپنے مرنے سے پیشتر فرما گئے ہیں ؎

تا زدیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یہی مقبولیت عام جو مرزائے مرحوم کے انتقال سے چالیس پینتالیس سال بعد پیدا ہوئی ہے موجودہ اشاعت کی اصلی محرک ہے اور اسی تحریک نے نہ صرف مہتمم مطبع نظامی کو بلکہ اکثر احباب کو آمادہ کردیا ہے کہ مرزا کے کلام کا صحیح اور دلکش ایڈیشن شائع کیا جائے۔

اب سے پہلے چند در چند ایڈیشن دیوان غالب کے چھپ چکے ہیں جن میں تین نسخے ایسے ہیں جو مرزائے مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئے اور ایک آدھ کی تصحیح بھی مرزا سے منسوب کی گئی ہے ان کے سوا چار پانچ نسخے متفرق مطبعوں سے نکلے ہیں۔ نیز دو تین شراح نے بذیل شرح دیوان کا بڑا حصہ چھاپ دیا ہے۔ مگر ان سب مطبوعہ نسخوں میں

کوئی نسخہ ایسا نہیں دیکھا گیا جو کم از کم دس پانچ فاحش غلطیوں کا حامل نہ ہو۔ ایسی صورت میں کہ خود مرزا کی زندگی میں دیوان شائع ہوا اور واقفین فن شرح کے ساتھ ان کا کلام چھاپیں پھر بھی ایک نہیں بیسیوں غلطیوں کا رہ جانا تعجب کی بات ہے۔

ہم نے اس دیوان میں جن باتوں کا التزام کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے عمدہ کاغذ۔ دلفریب خط۔ موزوں تقطیع صاف ستھری چھپائی کا خصوصیت سے انتظام کیا ہے۔ اور پھر آج کل کی سعادت کتابت سے تمام اُن نشانیوں کو باحتیاط تمام جا بجا منضم کیا ہے۔ جن کی بدولت معمولی اُردو خواں بھی بآسانی شعر کو پڑھ سکیں۔ پھر حتی الوسع صحت اشعار کا بھی خیال رکھا ہے اور مختلف دواوین اور شرحوں اور کلام مرزا کے حافظوں سے تصحیح و تصدیق و مقابلہ کیا ہے۔ ان اہتماموں کے بعد بھی اگر کوئی فروگزاشت رہ گئی ہو تو اس کو بجز اقتضائے بشریت اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہیچ نفسِ بشر خالی از خطا نہ بود۔

اس دیوان کی تحریک اشاعت اور ترتیب و تدوین کے متعلق خصوصیت کے ساتھ ہمیں دو معزز مہربانوں کا شکرگزار ہونا ہے۔ نمبر اول فخر قوم سید راس مسعود صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا (نبیرہ سر سید مرحوم) جن کی متواتر تحریک اور اصرار خاص نے ہمیں آمادہ کیا کہ دیوان غالب موجودہ حیثیت سے ملک میں شائع کریں اس کے بعد اپنے مکرم دوست سید معین الدین صاحب شاہجہانپوری مترجم اورنگ زیب نے پولین اعظم

کے دل سے ممنون ہیں کہ انھوں نے اشارات املائی اور تصحیح و تدوین کے اہم
اہم کو نظامی پریس کی خاطر انجام دیا پہلے انھوں نے مختلف چھاپے کے
دیوانوں کو پیشِ نظر رکھ کر نمونے کا ایک نسخہ اپنے قلم سے لکھا پھر اس کو
مار، ڈیش، علامتِ استفہام اور دیگر علامات سے مرتب و مزین کیا اسی
قلمی نسخے کی یہ نقل ہی جو آج آپ کے مبارک ہاتھوں تک پہونچنے کا فخر
حاصل کر رہی ہے۔

برحمت قرین باد ایں دست و پنجہ
کہ از بہر ما کرد ایں دست رنجہ

اس دیوان میں ناظرین کرام کو کچھ کلام ایسا بھی ملے گا جواب تک
کے مطبوعہ دواوین میں نہیں ہے۔ اگرچہ اس کلام کے سوا ہم کو اور کلام بھی
مرزا سے منسوب ملا مگر بعد تنقید و تحقیق جو کلام اُن کا متحقق ہوا وہی اس میں
شامل کیا گیا۔ کیونکہ یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مرزا غالب ہی کا کلام یہ
امتیازی فوقیت رکھتا ہے جو دوسروں کے کلام سے ممیز ہو سکتا ہے اور
اسی معیار نے ہم کو کھوٹی ٹکسال سے کھرے سکوں کے الگ کرنے کا
موقع دیا ورنہ ؎

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

کسی شاعر کے کلام کے مطالعہ سے قبل اُس کے مختصر حالات سے
واقف ہونا نہایت ضروری ہے اس لیے چند احباب کا اصرار

تھا کہ مرزا کی سوانح عمری بھی دیوان سے قبل دی جائے لیکن چونکہ اس مضمون پر مولانا حالی مرحوم کی ایک مبسوط تصنیف **یادگارِ غالب** شائع ہو کر ملک کے تمام علم دوست احباب کے ہاتھوں تک پہنچ چکی ہے لہذا اُسی کتاب سے مرزا کی لائف کے صرف مندرجہ ذیل اطلاعوں پر قناعت کی جاتی ہے۔

نام — مرزا اسد اللہ خاں المعروف بہ مرزا نوشہ

خطاب — نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ

تخلص — **غالب** ریختہ میں ابتدائً **اسد** لکھتے تھے

خاندان — ایبک ترک۔ سلسلۂ نسب تورا بن فریدوں سے ملتا ہے۔

ولادت — ۸ رجب سنہ ۱۲۱۲ھ بمقام آگرہ۔

تعلیم — اوّل اوّل شیخ معظم ہندی سے تعلیم پائی اُس کے بعد عبد الصمد نومسلم ایرانی سے جن کا آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد نام تھا۔ فارسی زبان حاصل کی۔

تاہل — مرزا کی شادی سنہ ۱۲۲۵ھ میں نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں کے یہاں ہوئی تھی۔

مسکن — زمانۂ طفولیت آگرے میں گزرا ۵۰ برس کے قریب دلی میں رہے لیکن کبھی کوئی ذاتی مکان نہیں خریدا۔ ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔

اولاد — کوئی اولاد صلبی نہیں چھوڑی ابتدا میں سات بچے ہوئے

مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔

شاعری — مرزا کو فن سخن میں اپنے کمال پر بہت کچھ ناز تھا جو بالکل بجا تھا سلامتی طبع محققانہ نظر اُن کا حصہ تھا اور باایں ہمہ وہ حق پسند بھی تھے۔ شاعری میں اُن کو باقاعدہ کسی سے تلمذ حاصل نہ تھا لیکن دقت پسندی کو چھوڑ کر جب سے وہ سلاست کی طرف متوجہ ہوئے تو کہنا پڑتا ہے کہ صفائی زبان میں انھوں نے میر تقی مرحوم کی تقلید کی۔ جن کے وہ بڑے معتقد تھے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
خود وہ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

اور ؎

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

تصانیف — دیوان اُردو کہا جاتا ہے کہ اُس کو مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کی رائے سے مرزا نے اپنے بڑے دیوان سے منتخب کیا تھا اس زمانے میں اکثر غزلیں جو اس دیوان میں نہیں پائی جاتیں غالب کے غیر مطبوعہ کلام کے نام سے شائع ہو رہی ہیں ہمارا۔ جہاں تک خیال ہے یہ وہی کلام ہے جس کو مرزا نے انتخاب میں نہیں لیا تھا) عود ہندی۔ اُردوئے معلےٰ۔ کلیات نثر و نظم فارسی

قاطع برہان، پنج آہنگ، مہر نیم روز (خاندان تیموریہ کی ناکمل تاریخ ہمایوں کے حالات تک) دستنبو (حالات غدر) گلِ رعنا (انتخاب دیوان اردو و فارسی) لطائف غیبی و سبدِ چین وغیرہ متفرق رسالے۔

شعر فہمی و علمی مشاغل کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ ایک سرسری نظر میں تہ کو پہونچ جاتے تھے حقائق اور معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ میں رہتی تھیں۔

بدیہہ گوئی اور ظرافت مرزا کی تقریر میں اُن کی تحریر اور اُن کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا بقول مولانا حالی مزاج میں اس قدر ظرافت تھی کہ اگر اُن کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان حاضر جوابی۔ بات میں بات پیدا کرنا اُن کی خصوصیات میں سے تھا۔

اخلاق فراخ حوصلگی اور مروّت نہایت وسیع الاخلاق کثیر الاحباب تھے جو شخص اُن سے ملنے جاتا کیسا ہی مغموم ہوتا خوش ہو کر آتا۔ فراخ حوصلہ ایسے کہ کوئی سائل اُن کے در سے خالی نہ پھرتا، غریبوں محتاجوں کی حتی الامکان مدد کرتے۔

خودداری بغیر پالکی یا ہوادار کے کبھی باہر نہ نکلے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ اُن کی ملاقات کو نہ آتے وہ بھی اُن کے مکان پر نہ جاتے مرزا کی خودداری کی ایک مشہور مثال ہو کہ جب دہلی کالج

پروفیسری کے لیئے بلائے گئے تو صرف اس بات پر بغیر ملے واپس
چلے آئے کہ مسٹر ٹامسن جنھوں نے بلایا تھا اُن کے استقبال کو نہیں آئے۔

معاش مرزا کو سات سو روپیے سالانہ کی پنشن ملتی تھی غدر کے بعد تین سال
تک یہ پنشن عارضی طور پر بند رہی تھی۔ اس زمانے میں مرزا کی نہایت
عسرت سے بسر ہوئی۔ غدر کے دو سال بعد دربار رامپور سے سو روپے
ماہوار ملنے لگے تھے جو وقتِ وفات تک جاری رہے لیکن یہ تنخواہ بھی
اُن کے خرچ کو کافی نہ ہوتی تھی۔ کبھی فراغت نصیب نہ ہوئی ایک
موقع پر فرمایا "میں کپڑے کھاتا ہوں"

مذہب مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے توحید وجودی
کے قائل تھے جس کا پتا اُن کی شاعری سے ملتا ہے اُن کو اہل بیت
سے نہایت محبت تھی اور غالباً وہ تفضیلی تھے۔ مولانا فخر قدس سرہ العزیز
کے خاندان میں مرید بھی تھے اسی وجہ سے اُن کی تجہیز و تکفین اہل
سنت کے طریقہ پر عمل میں آئی۔

وفات اور دفن مرزا نے ۷۳ برس چار مہینے کی عمر میں ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء کو دلی
میں انتقال کیا اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی میں دفن ہوئے

خاکسار
نظامی بدایونی

بدایوں (روہیل کھنڈ)
۱۰ فروری سنہ ۱۹۱۵ء

دیباچہ جو خود مصنف نے وقت ترتیب دیوان ہذا بزبان فارسی لکھا

مشام شمیم آشنایان را صلا و نہاد انجمن بینشان را مژدہ کہ نسخۂ از سفینہ مجموعہ گردانی آمادہ و دوانی از
عود ہندی دست بہم دادہ است نہ چوب ہاے سنگ خوردہ بے ہنجار نا طبعی شکستہ بے اندام تراشیدہ بلکہ
شگافتہ بکار رفتہ ریزہ ریزہ کردہ بسوہان خراشیدہ اید و دل بغیر از خستگی ہاے شوق جستجوے آتش پارسی است آتش کہ
رگ کنہاے خوردہ خاموش و از کف خاکستر بر رنگ خویش سیہ پوش مینی چہ بروے ستم است تا پاکی بے استخوان مغز
ہا رنگ شکستن و از دیوانگی برشتہ شمع مزار کشتہ آویختن ہر آئینہ بلا گریختن نیرزد و در بزم افروختن را نشایہ رخ آتش
بہ شعلہ بر افروزندہ و آتش پرست را بہ بادا فراہم مد آتش سوزندہ نیک سپردانند کہ پروانہ و ہندو و رہمیشہ آن درخشندہ آذر گل مید
آتش پرست کیش روشن ہوشنگ و زنگ دوں تافتہ و در ایوان لہراسپ نشو و نما یافتہ حسن افروغ است و لالہ را رنگ و مغز را
چشم و کلہ را جنبش بخشند و زوال مرد و لگین را فروزندہ سپاسم کہ شرارے از آں آتش تابناک بعد خاکستر خویش یافتہ بکا
کاوسینہ شکافتہ ام و در نفس دمیدہ ام پیمانہ بوکہ مکر ہاے سفتہ گاران آشنایہ فراہم توانا مد کہ مجموعہ را فروغ روشنائی چراغ
ندامی عود ماہ بال ہمت شانی دماغ تو اند بخشید بہاناگا ۔ مدعا این ناسپاس آن مدعا است کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بہ
گرد آوردن سرمایہ دیوان فارسی بخیز و و استغنا نشد کمال آتش فرو د علیم نزدی خورش نشیند امید کہ سخن سرایان سخنور ستاے
پراگندہ ابیاتے کہ خارج ازیں اوراق یابند آن را ترواش کلک این نامہ سیاہ نشناسند و جانشین گرد آورندہ داستان ستائش و نکوہش
آں اشعار مجنون و ملحوظ نسگالند یارب [illegible] ناشنیدہ [illegible] نقش [illegible] نقاش کرد سد
خاں موسوم و بہ میرزا نوشہ معروف و بہ غالب متخلص است جہاں کہ اکبر آبادی مولد و دہلوی مسکن است فرجام کار نجفی مدفن باد

تمام شد بست و چہارم شہر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ

---

۱ بے اندام: بے ڈھنگا ۲ [illegible] ۳ پاکی: بے قراری ۴ ہار بگسستن: [illegible] ناشتہ [illegible] فرادہ ۔ سزا شدہ: ہو و بند
[illegible] ٹکڑا [illegible] نقل [illegible] آتش: [illegible] ہوشنگ: ایک آتش پرست بادشاہ فارس کا نام ہے ۱۲
[illegible] لہراسپ: آتش پرست بادشاہ فارس کا نام ہے جو کیخسرو کا جانشین ہوا [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا	کاغذی ہے پیرہن - ہر پیکرِ تصویر کا !
۲ کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی - نہ پوچھ	صبح کرنا شام کا - لانا ہے جوئے شیر کا
۳ جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے	سینۂ شمشیر سے - باہر ہے - دم شمشیر کا

۱ نقش:- تصویر- تصویر اکثر کاغذ پر ہوا کرتی ہے اور ولایت (ایران) میں اہلِ فریاد کاغذی لباس پہن کر دادخواہ ہوتے تھے- مطلب یہ ہے کہ اگرچہ مصورِ حقیقی نے تصویرِ انسانی کھینچنے میں شوخیِ تحریر کا کمال دکھایا مگر انسان نے اپنے مراتب کی بوجہ ناپائداری صورتِ حال کے فرق پایا- اور یہ بول اٹھا- انسان بنا کے کیوں میری مٹی خراب کی- پیرہن کاغذی چونکہ نہایت بودا ہوتا ہے اس سے پیکرِ انسانی کی نسبت ظاہر ہو- خود مرزا نے عودِ ہندی میں جو مطلب لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہستی ملال و آزار کا سبب ہے اس لیے تصویر بھی بزبانِ حال فریاد کرتی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں رنجِ ہستی میں مبتلا کیا

۲ کاوکاو:- یعنی کاوش و تلاش- شاعر کا مطلب یہ ہے کہ عاشق کے لیے ہجر کی راتوں کا گزارنا ایسا ہی دشوار ہے جیسا کہ فرہاد کے لیے جوئے شیر کا لانا- الفاظ کاوکاو سے کوہ کنی کو اور صبح کے سپیدہ کو جوئے شیر سے جو مشابہت ہے وہ ظاہر ہے-

۳ جذبہ:- کشش- دمِ شمشیر:- تلوار کی باڑھ- مطلب یہ ہے کہ میرے شوقِ شہادت میں ایسی کشش ہے کہ اس کی وجہ سے سینۂ شمشیر سے دمِ شمشیر باہر کھنچا آتا ہے- گویا گلے ملنے کے لیے بیتاب ہو رہا ہے- عموماً دم سینے میں رہتا ہے- مگر جذبۂ بے اختیار سے تلوار کا دم لبوں پر آگیا ہے- اور ظاہر ہے کہ تلوار سے تلوار کی باڑھ باہر کی طرف ہوتی ہے ۱۲ - ۳

آگہیؔ - دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہی - اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں - غالبؔ - اسیری میں بھی آتش زیرِپا
موئے آتش دیدہ ہی - حلقہ مری زنجیر کا

جز قیس - اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا - مگر - بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا - کہ داغ کا سرمایہ دود - تھا

تھا خواب میں - خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی - نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ - رفت گیا - اور - بود تھا

ڈھانپا کفن نے - داغِ عیوبِ برہنگی
میں - ورنہ - ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

لہ یعنی سماعت کا شوق کتنی ہی کوشش کرے - میری تقریر کے مطلب سے آگاہ نہیں ہو سکتا ۱۲

لہ آتش زیرپا = بے قرار - موئے آتش دیدہ = وہ بال جو بہ وجہ گرمیِ آتش حلقہ دار اور کمزور ہو گیا ہو اور اس کی تشبیہ حلقۂ زنجیر سے ظاہر ہے - مطلب شعر کا یہ ہی کہ بوجہ میری بے قراری کے جو عالمِ اسیری میں ہی حلقۂ زنجیر مثل موئے آتش دیدہ کے کمزور ہو گیا ہی ۱۲

لہ بروئے کار آنا = مردِ میدان بننا - مگر = شاید - بہ تنگیِ چشمِ حسود = مثل چشمِ حاسد کے تنگ ۱۲ -

لہ سویدا = دل کا ایک سیاہ نقطہ - سودا کی تصغیر - داغ کی پونجی = دھواں ہی جس طرح دھوئیں سے داغ پیدا ہوتا ہی - اسی طرح پریشانیِ خاطر سے نقشِ سویدا درست ہوتا ہی - یعنی دل پر ایک سیاہ نقطہ پیدا ہوتا ہی شاعر نے سویدا کو داغ سے اور آشفتگی کو دود سے نسبت دی ہی ۱۲

لہ داغِ عیوبِ برہنگی سے شاعر کا مطلب انسانی صفات سے معرا ہونا ہی - ننگِ وجود = ننگِ ہستی ۱۲

تیشے بغیر مر نہ سکا۔ کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم۔ دل اگر پڑا پایا[1]
عشق سے طبیعت نے۔ زیست کا مزا پایا[2]
دوست دار دشمن ہے! اعتمادِ دل معلوم
سادگی و پُرکاری! بے خودی و ہشیاری![3]
غنچہ پھر لگا کھلنے۔ آج ہم نے اپنا دل
حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی

دل کہاں کہ گم کیجے۔ ہم نے مدعا پایا
درد کی دوا پائی۔ درد بے دوا پایا
آہ بے اثر دیکھی۔ نالہ نارسا پایا
حُسن کو تغافل میں۔ جرأت آزما پایا
خوں کیا ہوا دیکھا۔ گم کیا ہوا پایا
ہم نے بارہا ڈھونڈھا۔ تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے۔ زخم پر نمک چھڑکا[4]
آپ سے[5]۔ کوئی پوچھے۔ تم نے کیا مزا پایا

[1] یہ کہنا کہ اگر دل پڑا پایا تو نہ دیں گے ثابت کرتا ہے کہ دل پالیا ہے صرف چھیڑنے کے لیئے ستایا جاتا ہے پس ہم نے مدعا پالیا۔ (یعنی سمجھ گئے) کہ دل آپ کے پاس ہے۔ ۱۲

[2] عشق ایک ایسا درد ہے جس کی دوا نہیں۔ اور پھر وہی زندگی کا مزہ ہے۔ گویا بغیر عشق زندگی بہت دردناک تھی۔ ۱۲

[3] سادگی = بھولاپن۔ پرکاری = چالاکی۔ شاعر کہتا ہے کہ حسینوں کا تغافل بھی عشاق کی جرأت آزمانے کیلیے یعنی اُن کا دل دیکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ گویا اُن کا ظاہری بھولاپن فی الواقع چالاکی ہے۔ اور اُن کی بے خودی یعنی بے خبری اصلاً ہوشیاری ہے۔ ۱۲

[4] مطلب یہ ہے کہ ہمارا جوشِ جنون تازہ ہو گیا ہے۔ آمدِ فصلِ بہار ہے۔ [5] آپ سے اشارہ ناصح کی طرف ہے۔ بطور

دل مرا سوزِ نہاں سے - بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا - جل گیا

دل میں - ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی - کہ جو تھا جل گیا

میں عدم[۱] سے بھی پرے ہوں - ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض[۲] کیجیے - جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا - وحشت کا - کہ صحرا جل گیا

دل نہیں - تجھ کو دکھاتا - ورنہ - داغوں کی بہار
اس[۳] چراغاں کا - کروں کیا - کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی - آرزو - غالب - کہ دل
دیکھ کر طرزِ[۴] تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شوق[۵] - ہر رنگ - رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

طنز و تشنیع استعمال ہوا ہی ۱۲

۱ بالِ عنقا: بازوئے عنقا - شاعر نے اپنی فنا کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہی وہ اپنی ہستی کو عدم سے بھی پرے ظاہر کرتا ہی - بالِ عنقا جلنے کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ جس جگہ وہ ہی وہاں عنقا کو بال کشائی کا یارا نہیں ہی ۱۲-

۲ عرض کرنا: پیش کرنا: جوہرِ اندیشہ: سوچ بچار یا فکر کا - شاعر کہتا ہی کہ فکر کا جوہر جو مجھ میں موجود ہی اسے کس کے سامنے پیش کروں - اس میں اس قدر حرارت ہی کہ وحشت کا کچھ یوں ہی سا خیال آنے سے صحرا جل کر خاک ہو گیا - اظہارِ وحشت کی صورت میں خدا معلوم کیا ہوتا عرض کو جوہر سے تناسب الفاظ بالصورت ہی ۱۲

۳ کارفرما: کام کرنے والا یا لینے والا - ۱۲

۴ طرزِ تپاک سے مراد ظاہری تپاک اور منافقانہ برتاؤ ہی ۱۲-

۵ شوق: عشق - ہر رنگ: ہر طرح - بہر حال - رقیب: دشمن - رنگ کا لفظ تصویر کی مناسبت سے

لہ زخم نے داد نہ دی۔ تنگیِ دل کی۔ یارب
تیر بھی۔ سینۂ بسمل سے۔ پرافشاں نکلا

بوئے گل۔ نالۂ دل۔ دودِ چراغِ محفل
جو۔ تری بزم سے نکلا۔ سو پریشاں نکلا

تہ دلِ حسرت زدہ تھا مائدہ لذّتِ درد
کام یاروں کا۔ بہ قدرِ لبِ دنداں نکلا

سہ تھی نوآموزِ فنا۔ ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے۔ کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا۔ سو طوفاں نکلا!

ھہ دھمکی میں مرگیا۔ جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگار۔ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی۔ مرا رنگ زرد تھا

استعمال ہوا ہے۔ اس شعر کا مطلب صاف ہے صرف پردہ کا لفظ فریب دہ ہے۔ دراصل نفسِ معنی پر اس لفظ کا کوئی اثر نہیں۔ پردۂ تصویر سے خود تصویر ہے اور اضافت مجازی ہے۔ پردہ کی رعایت عریانی کے ساتھ ظاہر ہے۔ شاعر کے نزدیک قیس کی تصویر عریاں بھی کھینچی جاتی ہے۔ ۱۲-

لہ داد نہ دی: تدبیر نہ کی۔ پرافشاں: پھڑ پھڑاتا ہوا یعنی سراسیمہ اور پریشان۔

تہ مائدہ: کھانا دینے والا۔ اسباب یعنی دسترخوان۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے ہم دموں میں سے ہر شخص بہ قدرِ استعداد خود کامیاب ہوا۔ ۱۲

سہ بعض شرح و دیوانوں میں ہے نوآموزِ فنا ہے۔ بعض میں کی نوآموزِ فنا۔ مگر ایک پرانے نسخہ میں جو مرزا کی زندگی میں طبع ہوا ہے۔ تھی نوآموزِ فنا ہے جو اب ہے اور ہے کے مقابل میں قریب الفہم ہے۔ یعنی میری ہمت ایسی دشوار پسند تھی کہ درسِ فنا اس کے لیے ایک معمولی نوآموزی کا سا کام تھا۔ اس لیے سخت مشکل ہے کہ یہ دشوار کام بھی آسان ہے۔ ۱۲

ھہ بابِ نبرد: لائقِ نبرد یا جنگ کے قابل۔ عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا یعنی عشق جواں مردِ جنگ جو کو مقابلہ کے لیے چاہتا تھا۔ ۱۲-

تالیفِ نسخہ ہاے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر۔ کہ ساحلِ دریاے خوں ہی اب
اِس رہ گزر میں جلوۂ گُل آگے گرد تھا

جاتی ہی کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا۔ تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال۔ بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہی
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شمارِ سبحہ۔ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشاے بہ یک کف بُردنِ صد دل۔ پسند آیا

بہ فیضِ بے دلی۔ نومیدیِ جاوید۔ آساں ہی
کشائش کو۔ ہمارا عقدۂ مشکل۔ پسند آیا

ہواے سیرِ گل۔ آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلتیدنِ بسمل۔ پسند آیا

سلہ میں اُس وقت سے وفا کا عادی تھا جب کہ میری طفلی اور ناتجربہ کاری کا عالم تھا۔ ۱۲

سٓہ شمارِ سبحہ:۔ تسبیح کے دانوں کا شمار کرنا۔ مرغوب آیا:۔ مرغوب ہوا۔ صد دل بہ یک کف بردن:۔ ایک ہاتھ میں سو سو دل لے لینا۔ پسند آیا:۔ پسند ہوا۔ مطلب یہ ہی کہ معشوق کو تسبیح کا شمار کرنا جس میں عموماً سو دانے ہوتے ہیں اِس وجہ سے پسند آیا ہی کہ اس میں اس کی خواہش کے مطابق ایک ہی وار میں سو سو دل ہتیا لینے کی مشابہت موجود ہی ۱۲۔

سٓہ دنیا کی طرف سے بے دلی کے سبب ہمیشہ کی مایوسی کا برداشت کر لینا ہمارے لیے آسان ہی۔ دوسرے مصرعے میں شاعر کہتا ہی کہ ہمارا عقدۂ مشکل کشائش کو پسند آگیا ہی۔ یعنی اب ہماری مشکل کبھی آسان نہ ہوگی۔ کیونکہ خود کشائش کو جو عقدہ پسند آگیا ہو اُس کا حل ہونا معلوم ۱۲

سٓہ ہواے سیرِ گل:۔ سیرِ گل کی خواہش۔ آئینۂ بے مہریِ قاتل:۔ قاتل کی جفاجوی کا ثبوت۔ پہلے مصرعے میں فعل "ہی" محذوف ہی انداز بہ خوں غلتیدنِ بسمل:۔ بسمل کا خون میں لوٹنے کا انداز۔ مطلب یہ ہی کہ قاتل کا

جراحت[۱] تحفہ - الماس ارمغاں - داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ - غم خوارِ جانِ دردمند آیا

دہر میں نقشِ وفا - وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ[۲] خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی - حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ جفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل[۳] گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا

ہوں[۴] ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا - کہ مر جائیں - سو وہ بھی نہ ہوا

سیرِ گل دیکھنے کے لیے جانا اس کی جاسوسی کی دلیل ہے نہ کہ محبت گل کی۔ تماشائے گل اُسے صرف اس وجہ سے پسند ہے کہ گل کو خون میں لوٹنے والے بسمل سے مشابہت ہے۔ ۱۲

۱ جراحت: - بالکسر زخم الماس بالفتح - ہیرا اور جوہر دار تلوار کی ایک قسم - غم خوارِ جانِ دردمند عشق سے مراد ہے ۱۲

۲ زمرد: - سبز رنگ کا ایک قیمتی پتھر - افعی: - سانپ - سبزۂ خط کو زمرد سے تشبیہ دی ہے - کاکل کو افعی سے اپنے معشوق سے شاعر کہتا ہے کہ زمرد کے عکس سے سانپ تو اندھا ہو جاتا ہے - لیکن ترا سبزۂ خط کیسا زمرد ہے کہ زلف کے سانپ پر اُس کا کچھ اثر نہیں ہوا - سبزۂ خط نکل آنے کے باوجود زلف کا زہریلا اثر یعنی دل فریبی بدستور باقی ہے ۱۲

۳ مصرعِ ثانی کے معنی کہنے سے شعر کا مطلب صاف ہو جاتا ہے - شاعر کہتا ہے کہ اگر سانس پرہیزگاری کی منزل پہونچنے کی راہ نہیں بن سکتی تو دل شراب اور جام کے خیال کی گزرگاہ بن سکتا ہے - یعنی اگر متقی بننا ممکن نہیں تو رند ہی سہی ۱۲

۴ گلبانگ: - آواز ۱۲

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ستائش گر ہی زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہی ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہی تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہی سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشیدِ عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہی اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہی خونِ گرم دہقاں کا

اگا ہی گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہی میرے درباں کا

۱ حریف:- مقابل۔ حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا: یعنی دمِ عیسیٰ کو برداشت نہ کر سکا ۱۲

۲ قطرہ خون کو مرجان یعنی مونگا کے دانے سے جو تسبیح میں پڑا ہوا ہو تشبیہ دی ہی ۱۲۔

۳ سطوت: رعب۔ نیستاں:- نے پیدا ہونے کی جگہ۔ نے وہ چیز ہی جس سے نالے کے مانند آواز پیدا ہوتی ہی
شعر کا مطلب یہ ہی کہ میں نے رعبِ معشوق سے مرعوب ہو کر بطورِ عجز دانت میں تنکا لیا تھا۔ لیکن اُس کا
رعب میرے نالوں کو نہ روک سکا اور وہ تنکا جو اظہارِ عجز کے لیے دانت میں لیا تھا ریشۂ نیستاں بن گیا۔
یعنی نالہ کشی کی جڑ بن گیا ۱۲۔

۴ ہیولیٰ: مادہ۔ خونِ گرم: سرگرمی برقِ خرمن:- اس شعر کا خلاصہ یہ ہی کہ وجود در حقیقت فانی ہی کہ
فانی عنصروں سے بنایا گیا ہی۔ اس سے بھی زیادہ صاف مطلب یہ ہو سکتا ہی کہ میرا وجود میری فنا کی دلیل ہی
جس طرح دہقان کی سرگرمی خود اُس کی خرمن (کھلیان) کے لیے بجلی کا کام کرتی ہی۔ غرض یہ ہی کہ نہ دہقان
اپنی سرگرمی و کوشش سے خرمن اکٹھا کرتا نہ بجلی اُس کو برباد کرتی ۱۲۔

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز[١] اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر[٣] میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

نہ ہوگا[٤] یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

---

١ اس شعر میں خیالِ یار کو یوسف اور دلِ افسردہ کو حجرۂ زنداں سے تشبیہ دی ہے ۱۲۔

٢ لہو پانی ہونا۔ بہ معنی رونا۔ مژگانِ سرشک آلودہ = آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی پلکیں ۱۲

٣ جادۂ راہِ فنا کو دنیا کے اجزائے پریشاں کا شیرازہ اس لیے کہا گیا کہ تمام اوراقِ عالمِ فنا کے ایک ہی رشتہ میں سیئے ہوئے ہیں ۱۲۔

٤ یک بیاباں ماندگی = کثرتِ ماندگی۔ ذوق = ذوقِ رہ نوردی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح موج کا ذوقِ روانی کبھی کم نہیں ہوتا۔ اسی طرح میرا ذوقِ رہ نوردی بھی کم نہیں ہوتا۔ چاہے میں کتنا ہی کیوں نہ تھک جاؤں ۱۲

شاعر کہتا ہے کہ پہلے مجھے چمن سے عشق تھا اب یہ حال ہے کہ بوئے گل سے ناک میں دم آتا ہے یعنی جی بیزار ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے کے لفظی معنی یہ ہیں کہ بوئے گل دم کھینچنے کے ساتھ ناک میں آتی جس سے شاعرانہ یہ مطلب نکالا ہے کہ بوئے گل سے ناک میں دم آتا ہے اور ناک میں دم آنا محاورہ ہے جو بیزار ہونے کے موقع پر بولا جاتا ہے ۱۲

[1] سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں - اور افسوس حاصل کا

[2] بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو - دریائے مے ہے - تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

[3] محرم نہیں ہے تو ہی - نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے - پردہ ہے - ساز کا

[4] رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے - شگفتنِ گُل ہائے ناز کا

[5] تو - اور سوئے غیر - نظرہائے تیز تیز
میں - اور دُکھ - تری مژہ ہائے دراز کا

[6] صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا - وگرنہ - میں
[7] طُعمہ ہوں - ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے - سر شیشہ باز کا

[1] سراپا رہنِ عشق : یعنی ہمہ تن مبتلائے عشق - ناگزیرِ الفتِ ہستی : یعنی محبتِ حیات کے لیے مجبور ہوں - عبادت برق یعنی مطیعِ عشق افسوس حاصل کا : یعنی زندگی کے ضائع ہونے کا رنج - خلاصہ یہ ہے کہ میں ہمہ تن بندۂ عشق ہوں اور محبتِ زندگی نے بھی مجبور کر رکھا ہے - مگر بوجہ تکلیفِ عشق برق کو میں نے اپنا معبود بنا لیا ہے - چونکہ وہ جلاتی ہے اس لیے اپنی ہستی پر افسوس ہے گویا موت کا طالب ہوں ۱۲ -

[2] خمیازہ : انگڑائی مجازاً بُرے کام کا نتیجہ ۱۲

[3] محرم - حرم یعنی پردہ نشینوں میں آ جاتا ہے - مجازاً وہ شخص جو بھیدوں سے واقف ہو مثلاً محرمِ راز - حجاب یعنی پردہ جس کو پردۂ ساز کے ساتھ لفظی مناسبت حاصل ہے : - شعر کا مطلب یہ ہے کہ تو بھید کی باتوں سے خود ناواقف ہے یا یہ کہ تیرے پاس گوشِ شنوا نہیں ورنہ دنیا میں جو بظاہر تجھے پردہ نظر آتا ہے وہ بھی پردہ ساز کی طرح اسرارِ الٰہی ظاہر کر رہا ہے یعنی جو چیزیں بظاہر مانعِ کشفِ راز معلوم ہوتی ہیں وہ درحقیقت کاشفِ راز ہیں

[4] اس شعر میں شاعر نے اپنے رنگِ شکستہ یعنی اُڑے ہوئے رنگ کو بہارِ نظارہ کی صبح سے تشبیہ دی ہے اور چونکہ صبح کے وقت پھول کھلتے ہیں - اس لیے وہ اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ صبح کے وقت میرے منہ پر ہوائیاں اُڑتے ہوئے دیکھ کر تو بھی اپنے ناز کے پھول کو کھلنے دے یعنی سرگرمِ ناز ہو ۱۲

[5] مژہ ہائے دراز : دل میں گھر کرنے والی مژگاں ۱۲ [6] صرفہ : فائدہ - [7] طعمہ : بالضم - خورش و لقمہ - گوشۂ بساط : بزم

کاوش[۱] کا دل کرے ہے تقاضا۔ کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض۔ اُس گرہِ نیم باز[۲] کا

تاراج[۳] کاوشِ غمِ ہجراں ہوا۔ اسدؔ
سینہ۔ کہ تھا۔ دفینہ گُہرہائے راز کا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھُلا
رکھیو یارب! یہ درِ گنجینۂ گوہر کھُلا

شب ہوئی پھر۔ انجمِ رخشندہ کا۔ منظر کھُلا
اِس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھُلا

گرچہ ہوں دیوانہ۔ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ[۴] پنہاں۔ ہاتھ میں نشتر کھُلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں۔ گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے؟ کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھُلا[۵]!

ہے خیالِ حُسن میں۔ حُسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے۔ میری گور کے اندر کھُلا

منہ نہ کھلنے پر ہے۔ وہ عالم۔ کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب۔ اُس شوخ کے منہ پر کھُلا[۶]

در پہ رہنے کو کہا۔ اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

عیش کے (جس کے کونوں پر شراب جمی ہوئی ہو) فرش کا گوشہ۔ شیشہ باز وہ بازی گروں کا ایک فرقہ ہے جو سر پر شیشہ رکھ کر ناچتے ہیں ۱۲

[۲] گرہِ نیم باز۔ مراد دل سے ہے یعنی جو دل بوجہ تنگی گرہ ہو کے رہ گیا ہے ۱۲

[۳] اے اسد میرے سینے کو جس میں بہت سے راز پوشیدہ تھے غمِ ہجراں نے تاراج کر دیا۔ یعنی غمِ معشوق کی جدائی کے غم نے مجھے رسوا کیا۔ ۱۲

[۴] دشنہ بالفتح بمعنی خنجر ایک شارح نے بجائے دشنہ کے دست لکھ کر اس کی شرح لکھی ہے لیکن یہ ایجاد بندہ ہے ۱۲

[۵] پری پیکر کھُلا: معشوق بے تکلف ہوا ۔ ۱۲

[۶] منہ پر کھُلا: ۔ نقاب منہ پر بھلا معلوم ہوا ۔ ۱۲

کیوں اندھیری ہی شبِ غم؟ ہی بلاؤں کا نزول[۱]
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھُلا

کیا رہوں غربت میں خوش؟ جب ہو حوادث کا یہ حال[۲]
نامہ لاتا ہی وطن سے نامہ بر اکثر کھُلا

اُس کی اُمّت میں ہوں میں۔ میرے رہیں کیوں کام بند[۳]
واسطے جس شہ کے غالبؔ۔ گنبدِ بے در کھُلا

ق

شب۔ کہ برقِ سوزِ دل سے۔ زہرۂ ابر۔ آب تھا[۴]
شعلۂ جوّالہ۔ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں۔ کرم کو۔ عذرِ بارش۔ تھا عناں گیرِ خرام
گریے سے۔ یاں پنبۂ بالش۔ کفِ سیلاب تھا[۵]

واں۔ خود آرائی کو۔ تھا موتی پرونے کا خیال
یاں۔ ہجومِ اشک میں۔ تارِ نگہ نایاب تھا

---

[۱] پہلے مصرعہ کا جزو اوّل سوال اور اس شعر کے دوسرے مصرعے میں اس کا جواب دیا گیا ہی یعنی ستاروں کا رُخ آسمان کی طرف پھرا رہے گا ۱۲

[۲] غربت = مسافرت۔ کھُلا خط وہ روانہ ہوتا ہی جس میں خبر مرگ لکھی جاتی ہی ۱۲

[۳] گنبدِ بے در = آسمان۔ گنبدِ بے در کے کھلنے سے واقعۂ شبِ معراج کی طرف اشارہ ہی ۱۲

[۴] زہرہ بفتح اوّل = بہ معنی پِتّا دلیری و شجاعت جوّالہ۔ کودنے والا۔ گردش کرنے والا۔ مطلب یہ ہی کہ رات کو دل کی تپش بشکل برق تھی اس سے ابر کا پِتّا پانی ہو گیا تھا اور اُس کے اثر سے جو بھنور پانی میں پڑتا تھا۔ شعلۂ جوّالہ کی طرح چکر کھا رہا تھا۔

[۵] پنبۂ بالش = تکیہ کی روئی۔ کفِ سیلاب = سیلاب کے جھاگ یعنی اس کا کرم بارش کی وجہ سے نہ ہو سکا

جلوۂ گل نے کیا تھا۔ واں چراغاں ۔ آب جو۔
یاں۔ رواں مژگانِ چشمِ تر سے۔ خونِ ناب تھا
یاںؔ۔ سرِ پُرشور بے خوابی سے۔ تھا دیوار جو
واں۔ وہ فرقِ ناز۔ محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں۔ نفس کرتا تھا روشن۔ شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں۔ بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرشؔ سے تا عرش۔ واں۔ طوفاں تھا۔ موجِ رنگ کا
یاں۔ زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاںؔ۔ اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل۔ کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

اور یہاں بوجہ گریہ تکیے کی روئی کف سیلاب نظر آتی تھی ۱۲

لہ دیوار جو = دیوار کو تلاش کرنے والا۔ شاعر نے سر کو دیوار تلاش کرنے والا کہا ہے مطلب یہ ہے کہ ہجر میں بے خوابی کی وجہ سے میرا سر دیوار سے ٹکرانے کے لیے دیوار کا متلاشی تھا۔ فرقِ ناز = معشوق کا پرورده سر ۱۲

عہ موجِ رنگ کا طوفان تھا = فصلِ گل کا جوش تھا۔ سوختن کا باب تھا = سوختن کا مصدر گردانا جا رہا تھا یعنی جلنا ہی جلنا تھا۔ ۱۲

تلہ اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا: یہاں کہنے لگا کا دل۔ ناخن استعارہ ہے کاوشِ غم سے ۱۲

مندرجۂ بالا اشعار قطعہ بند ہیں۔ اس قطعہ میں شاعر نے اپنی ناکامی اور معشوق کی لاپروائی کا مقابلہ کیا ہے اور اس چھٹے شعر میں وہ دوسری غزل کی طرف جو اسی قافیے ردیف میں لکھی ہے اشارہ کرتا ہے۔ ۱۲

———— ❀ ————

ؔ۱ نالہ دل میں شب - انداز اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

ؔ۲ مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہی!
خانۂ عاشق - مگر - سازِ صدائے آب تھا

ؔ۳ نازشِ ایامِ خاکستر نشینی - کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ - وقفِ بسترِ سنجاب تھا

ؔ۴ کچھ نہ کی - اپنے جنونِ نارسانے - ورنہ - یاں
ذرہ ذرہ - روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟
کل تلک - تیرا بھی دل - مہر و وفا کا باب تھا

ؔ۱ نایاب تھا: - نہ تھا - سپند کالا دانہ جو دفع نظر بد کے لیے جلاتے ہیں - مطلب یہ ہی کہ رات کو میرے دل نے جو نالہ کیا وہ بے اثر تھا - یعنی میرے لیے مفید نہ تھا - بلکہ بجائے اس کے کہ اس سے مجھے فائدہ پہونچتا وہ باوجود بے تابی رقیب کی بزم وصل کے لیے سپند بن گیا - یعنی اُس نے رقیب کی بزم وصل کو نظر بد سے بچانے کی خدمت انجام دی ۱۲ -

ؔ۲ مقدم سیلاب: - سیلاب کا آنا - مقدم بالفتح کسی جگہ سے واپس آنے کو کہتے ہیں - نشاط آہنگ: مسرور سازِ صدائے آب - شاعر نے فارسی ترکیب سے یہ جملہ بنا کر جل ترنگ کا مفہوم ادا کیا ہی - جل ترنگ ایک ہندوستانی باجا ہوتا ہی جس میں سات پیالوں میں کم و بیش پانی رکھا جاتا ہی اور اسے سارنگی کے پردوں سے ملا دیا جاتا ہی - آہنگ و ساز میں جو مناسبت ہی وہ ظاہر ہی ۱۲

ؔ۳ پہلوئے اندیشہ: پہلوئے خیال - سنجاب: بالکسر ایک جانور کا نام ہی جس کے پوست سے پوستین بناتے ہیں اور اسی پوستین کو بھی سنجاب کہتے ہیں جس کا رنگ خاکی ہوتا ہی - اسی وجہ سے خاکستر نشینی اور بستر سنجاب کا مقابلہ پُر لطف ہی - شاعر نے اس شعر میں قناعت پر اظہار فخر کیا ہی کہ مجھے خاک نشینی میں بھی بستر سنجاب کے مزے ملتے تھے ۱۲ ؔ۴ کچھ نہ کی: - کچھ نہ ہو سکا - جنونِ نارسا - عشقِ ناتمام -

یاد کرو وہ دن - کہ ہر اِک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں - اک دیدۂ بے خواب تھا

میںؔ نے روکا رات غالب - کو - ورنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں - گردوں کفِ سیلاب تھا

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں - اور ماتمِ یک شہرِ آرزو[۳]
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو - کہ میں[۴]
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا - نہ پوچھ حال[۵]
ہر ذرہ - مثلِ جوہرِ تیغ - آب دار تھا

روکش: مقابل ۱۲-

لہ یعنے اُس کے سیلابِ گریہ کی بلندی آسمان تک پہونچ جاتی ۱۲-

سہ ماتمِ یک شہرِ آرزو: وہ ہزاروں آرزوؤں کا خون کہ شہرِ آرزو میں وہی ترکیب ہے جو یک بیاباں ماندگی میں ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۹ نوٹ نمبر ۴) تمثال: - تصویر مطلب یہ ہے کہ جب تو نے وہ آئینہ جس میں تیری تصویر تھی توڑ ڈالا تو میری ہزاروں آرزوؤں کا خون ہو گیا یعنی مجھے انتہا درجہ کا رنج ہوا-

سہ ہوا: - آرزو - رہ گزار سے مراد رہ گزرِ معشوق ہے ۱۲-

ہہ سراب بالفتح: - وہ ریت جو دور سے چمکتی ہے اور پیاسے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا بہہ رہا ہے اسی مناسبت سے موجِ سراب کہا گیا ہے اور جس طرح سراب سے پیاسا دھوکا کھاتا ہے اسی طرح وفا محض سراب ہے - دنیا میں اس کا وجود نہیں ہے شاعر کا مطلب یہ ہے دشتِ وفا کے سراب کا ہر ذرہ مثل جوہرِ تیغ کے عشاقِ باوفا کا قاتل ہے ۱۲-

کم[1] جانتے تھے۔ ہم بھی غمِ عشق کو۔ پر اب
دیکھا تو۔ کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

بس کہ دشوار ہے۔ ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں۔ انساں[2] ہونا

گریہ چاہے ہے۔ خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق۔ کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر۔ اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر[3] آئینہ بھی۔ چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عید[4] نظارہ ہے۔ شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو[5] ہو۔ اور آپ بہ صد رنگِ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل۔ زخمِ تمنا[6] کھانا
لذتِ ریشِ جگر۔ غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

[1] کم ہونے پر بھی زیادہ نکلا ۱۲

[2] انسان ہونا: یعنی انسان کامل ہونا جو حقیقی صفات اور سیرت انسانی کا نمونہ ہو ۱۲

[3] آئینہ سے آئینۂ فولادی مراد ہے کیونکہ جوہر اُسی میں ہوتا ہے۔ آئینہ کو آنکھ سے تشبیہ دی ہے۔ ۱۲

[4] شمشیر کو ہلال سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ شمشیر عریاں کو ہلالِ عید سمجھکر عشاق خوش ہوتے ہیں۔ عید نظارہ سے مراد وہ عید ہے جس میں معشوق کی دید نصیب ہو ۱۲۔

[5] بصد رنگِ گلستاں ہونا: خوشی سے باغ باغ ہونا ۱۲۔

[6] زخمِ تمنا کھانا: آرزو پوری نہ ہونا ۱۲

۱

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۱) شب۔ خمارِ شوقِ ساقی۔ رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ۔ صورت خانہ خمیازہ تھا

(۲) یک قدم وحشت سے۔ درسِ دفترِ امکاں کھُلا
جادہ۔ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ۔ کون ہے؟
خانۂ مجنونِ صحرا گرد۔ بے دروازہ تھا

پوچھ مت۔ رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن
دست مرہونِ حنا۔ رخسار رہنِ غازہ تھا

(۳) نالۂ دِل نے دیئے اوراقِ لختِ دل۔ بہ باد
یادگارِ نالہ اِک دیوانِ بے شیرازہ تھا

(۱) شوقِ ساقی: ساقی کی آمد کا شوق۔ رستخیز اندازہ: قیامت کی شکل۔ خمیازہ: انگڑائی۔ محیطِ بادہ: ظرفِ شراب کا وہ خط جہاں تک شراب بھری ہو۔ مطلب یہ ہے کہ رات ساقی کی آمد آمد کے شوق نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ یہاں تک کہ خود شراب بھی خمیازہ کش تھی گویا ساقی کے شوق میں تمام شراب خانے میں صورت خانہ خمیازہ کی کیفیت نظر آ رہی تھی ۱۲

(۲) یک قدم وحشت: ایک وحشت جادہ یعنی جادۂ وحشت۔ دو عالم دشت: کثرتِ ویرانی ۱۲۔

(۳) دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد: یہ جملہ فارسی محاورہ ہے "اوراقِ لختِ دل بہ باد دادن" سے لیا گیا ہے۔ اس شعر میں دل کو دیوان سے اور دل کے ٹکڑوں کو اوراقِ دیوان سے نسبت دی گئی ہے۔ اس شعر کا

لہ
دوست - غم خواری میں میری - سعی فرمائیں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک - ناخن نہ بڑھ آئیں گے - کیا؟

بے نیازی حد سے گزری - بندہ پرور - کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل - اور آپ فرمائیں گے "کیا"

حضرتِ ناصح - گر آئیں - دیدہ و دل - فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں - وہ اب لائیں گے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قید - "اچھا" یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز - چھٹ جائیں گے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں - زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا - زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

تہ
ہے اب اِس معمورے میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ - دِلّی میں رہیں - کھائیں گے کیا؟

مطلب یہ ہے - نالۂ دل نے اُن اوراق کو پریشان کر دیا - اور دل ایک دیوان بے شیرازہ کی طرح ہو گیا ۱۲ -

لہ : پہلے اور دوسرے مصرعے میں "کیا" مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے شاعر کہتا ہے کہ دوستوں کو میرے ناخن کاٹنے سے کیا فائدہ کیا پھر بڑھ نہ آئیں گے ۔ تہ شاعر کہتا ہے کہ شہر دہلی میں آج کل غمِ الفت کا قحط ہے یعنی معشوقوں کی کمی ہے ۱۲ -

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم - تو یہ جان - جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے؟ اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا - اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے - ترے تیرِ نیم کش[۱] کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی؟ جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے؟ کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا - کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو - یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے - پہ کہاں بچیں؟ کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا - غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں؟ کہ کیا ہے - شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا؟ اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا - ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟
نہ کبھی جنازہ اٹھتا - نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا؟ کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی - تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان **غالب**!
تجھے ہم ولی سمجھتے - جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے - نشاطِ کار[۲] - کیا کیا
نہ ہو مرنا - تو جینے کا مزا کیا؟

تجاہل پیشگی - سے - مدعا کیا؟
کہاں تک - اے سراپا ناز کیا کیا؟

۱؎ تیرِ نیم کش: - وہ تیر جسے چھوڑتے وقت کمان دار نے کمان کو پورا نہ کھینچا ہو ۱۲ -

۲؎ نشاطِ کار: - یعنی کام کرنے کی امنگ ۱۲ -

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں	شکایت ہائے رنگیں کا - گلا - کیا؟
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں	تغافل ہائے تمکیں آزما - کیا؟
فروغِ شعلۂ خس - یک نفس ہے	ہوس کو - پاسِ ناموسِ وفا - کیا؟
نفس - موجِ محیطِ بے خودی ہے	تغافل ہائے ساقی کا گلا - کیا؟
دماغِ عطرِ پیراہن - نہیں ہے	غمِ آوارگی ہائے صبا - کیا؟
دلِ ہر قطرہ ہے - سازِ انا البحر	ہم اُس کے ہیں - ہمارا پوچھنا کیا؟
محابا کیا ہے؟ میں ضامن - اِدھر دیکھ	شہیدانِ نگہ کا - خوں بہا - کیا؟
سُن - اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن	شکستِ قیمتِ دِل کی صدا - کیا؟
کیا کس نے جگرداری کا دعوے؟	شکیبِ خاطرِ عاشق - بھلا - کیا؟

۱ نوازش ہائے بیجا :- غیروں پر مہربانی - شکایت ہائے رنگیں :- وہ شکایتیں جو بطریق محبت ادا کی جائیں نہ بطور شکوہ ۱۲ -

۲ نگاہ بے محابا : نگاہ بے تکلف و بے حجاب - تغافل تمکیں آزما :- وہ چشم پوشی جو صبر کی آزمائش کے لیے کی جائے

۳ ہوس :- رقیب کی جھوٹی محبت کی طرف اشارہ ہے کہ رقیب کی محبت شعلۂ خس کی طرح دم بھر کی ہے اُس کو ناموس وفا کا پاس نہیں ہے ۱۲

۴ عطر پیراہن :- عطر پیراہن یار - اس شعر میں شاعر نے دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا ہے - وہ کہتا ہے کہ جس شخص کو دنیا کی ہوس نہ ہو اُسے دُنیا کی بے وفائی کا کیا غم ہو سکتا ہے ۱۲

۵ سازِ انا البحر :- وہ باجا جس سے یہ آواز نکلے کہ میں دریا ہوں - ۱۲

۶ محابا کیا ہے :- تامل کیا ہے ۱۲

۷ شکست دل کو شاعر نے شکستِ قیمتِ دل سے تعبیر کیا ہے مطلب یہ ہے کہ شکستِ دل کی صدا اگر تجھے ابھی معلوم ہوتی ہو تو تو دل شکنی کیے جا اور یہ صدا سنے جا - بھلا میرے دل کی اور صدائے شکستِ دل کی تجھے کیا پروا ہوتا نہ رہے ۱۲ ۸ جگرداری :- استقلال ۱۲ -

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما۔ کیوں؟[1] یہ۔ کافر فتنۂ طاقت رُبا۔ کیا؟

بلائے جاں ہی غالب۔ اُس کی ہر بات
عبارت کیا۔ اشارت کیا۔ ادا کیا

در خورِ قہر و غضب۔ جب۔ کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہی؟ کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی۔ وہ آزادہ و خودبیں ہیں۔ کہ ہم
اُلٹے پھر آئے۔ درِ کعبہ۔ اگر۔ وا۔ نہ ہوا

سب کو مقبول ہی۔ دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو۔ کوئی بُت۔ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں۔ نازشِ ہم نامیِ[2] چشم خوباں۔
تیرا بیمار۔ بُرا کیا ہی؟ گر اچھا نہ ہوا

سینے[3] کا داغ ہی وہ نالہ۔ کہ لب تک نہ گیا۔
خاک کا رزق ہی وہ قطرہ۔ جو۔ دریا نہ ہوا

[1] کافر فتنۂ طاقت رُبا:۔ اشارہ ہی: وعدۂ صبر آزما کی طرف جس کا ذکر مصرعۂ اولیٰ میں ہی ۱۲۔

[2] ہم نامیِ چشم خوباں۔ اس وجہ سے کہا ہی کہ معشوق کی آنکھ کو بیمار کہتے ہیں ۱۲

[3] سینے کا داغ ہی:۔ قابل شرم ہی۔ خاک کا رزق ہی:۔ رائگاں ہی ۱۲

نام کا میرے ہے وہ دُکھ۔ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ۔ کہ برپا نہ ہوا

ہر بُنِ مو سے۔ دمِ ذکر۔ نہ ٹپکے[1] خوں ناب؟
حمزہ کا قصّہ ہوا۔ عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں۔ دجلہ دکھائی نہ دے؟ اور جزو میں کُل؟[2]
کھیل لڑکوں کا ہوا۔ دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم۔ کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے۔ پہ تماشا نہ ہوا

اسؔد! ہم وہ جنوں جولاں[3]۔ گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو۔ پشت خار۔ اپنا

بے[4] نذرِ کرم۔ تحفہ۔ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ۔ دعویٰ پارسائی کا

---

[1] نہ ٹپکے خوں ناب؟ = کیوں نہ ٹپکے؟ یعنی ضرور ٹپکے۔ استفہام اقراری ہے۔
[2] اس شعر کے پہلے مصرعہ میں بھی استفہام اقراری کی خوبی موجود ہے۔ یعنی دیدۂ بینا کو ضرور جزو میں کُل کا تماشا نظر آتا ہے۔
[3] جنوں جولاں: جنون رکھنے والا جولان۔ اپنی بے سروپائی اس سے ظاہر کی ہے کہ پشت خار تک نداد ہے۔ پنجۂ مژگانِ آہو کو اپنا پشتِ خار قرار دیا ہے۔ جس سے اپنی انتہائی وحشت کا اظہار منظور ہے ۱۲ [4] بے نذرِ کرم: = درگاہ و

لہ نہ ہو۔ حسنِ تماشا دوست۔ رسوا بے دفائی کا
بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہو دعوی پارسائی کا
سے زکاتِ حسن دے۔ اے جلوۂ بینش۔ کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو۔ کاسہ گدائی کا
سے نہ مارا جان کر بے جرم۔ قاتل۔ تیری گردن پر
رہا۔ مانندِ خونِ بے گنہ۔ حق آشنائی کا
سے تمنائے زباں۔ محوِ سپاسِ بے زبانی ہو۔
مٹا جس سے تقاضا۔ شکوہ بے دست و پائی کا

خداوندی میں نذر گزراننے کے لیے میری شرمِ نارسائی کا تحفہ یعنی شرمِ نارسائی کی طرف سے تحفہ۔ میری پرہیزگاری کا وہ دعویٰ ہو جس کا سو گناہوں کے ہاتھ خون ہو چکا ہو۔ شرمِ نارسائی فاعل ہے "ہو" کا

لہ حُسنِ تماشا دوست: وہ حسن جو اپنی نمائش کو دوست رکھے۔ رسوا بے دفائی کا ۔ فارسی ترکیب "رسوائے بے دفائی" کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر میرے یار کا حُسن دوسروں کو اپنا جلوہ دکھانا ناپسند کرتا ہے تو اس پر الزام بے دفائی عائد نہیں ہو سکتا۔ اگر میرے سوا اُس کے سو دیکھنے والے بھی ہوں تو یہ سو نگاہیں اُس کے دعوئے پارسائی پر مہر کرتی ہیں ۱۲۔

سے شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ اپنے حسن کی زکات دے تاکہ سورج کے مانند فقیر کا کاسۂ گدائی اُس کے گھر کا چراغ بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے حسن سے جو معدنِ نور ہے اگر چالیسواں حصہ (زکات میں مال کا چالیسواں حصہ سال بھر کے بعد دیا جاتا ہے) بھی عاشق کو مل جائے گا تو عاشق کا دل معرفتِ الٰہی کے نور سے مالامال ہو جائیگا۔

سے اس شعر میں قاتل کو مخاطب کیا گیا ہے "اے" حرفِ ندا محذوف ہے۔ بعض نسخوں میں قاتل کی جگہ غافل لکھا ہے لیکن سب سے پرانے نسخے میں جو ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی دہلی میں چھپا ہے اور جس کی کاپیوں کی صحت خود مرزا نے کی ہے غافل نہیں بلکہ قاتل ہے۔ مطلب یہ ہے۔ اے قاتل تو نے بے جرم جان کر مجھے نہیں مارا اس لیے آشنائی کا حق تیری گردن پر خونِ بے گناہ کی طرح رہا۔ یعنی حق آشنائی یہ تھا کہ تو مجھے قتل کر دیتا ۱۲۔ سے شاعر کہتا ہے زبان کی تمنا

وہی اک بات ہی جو یاں نفس واں نکہتِ گُل ہی
چمن کا جلوہ باعث ہی مری رنگیں نوائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہی تیری بے وفائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول **غالب** مختصر لکھدے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہی آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پانوں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

اِس شکر میں محو ہی کہ اِس کو بے زبانی کی نعمت عطا ہوئی ہی۔ اِس کی وجہ سے بے دست و پائی کے شکوہ کا تقاضا بھی مٹ گیا۔ یعنی بے دست و پائی کے شکوہ کا تقاضا یہ تھا کہ مجھے بیان کر مگر بے زبانی کے سبب وہ تقاضا اس کا مٹ گیا گویا بے زبانی کا احسان ہوا کہ مجھے شکوہ کے بجائے تسلیم کا درجہ ملا۔

سلہ "وہی اک بات" اشارہ ہی جلوہ چمن کی طرف اور جلوہ چمن سے فصلِ بہار مراد ہی ۱۲۔

سلہ پیغارہ = طعنہ۔ یہ شعر نہایت پیچیدہ ہی۔ خاص کر زنجیرِ رسوائی کی ترکیب نہایت دقیق ہی۔ ہماری رائے میں اس شعر کا مطلب یہ ہی کہ ہر طعنہ زن معشوق کا منہ تیرے حق میں زنجیرِ رسوائی بن گیا۔ یعنی تیری بے وفائی کی شہرت جو تجھ کو رسوا کرنے والی تھی ایک معشوق سے گزر کر دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہونچی اور اُس شہرت کا سلسلہ یوں ہی دور تک چلا گیا اور اس طرح سے زنجیرِ رسوائی کی صورت پیدا ہو گئی۔ اور جب معشوقوں کے گروہ میں جو خود بے وفا ہوتے ہیں۔ تیری بے وفائی کا چرچا اس حد تک پہونچ گیا تو گویا عدم تک پہونچ گیا یعنی اُس کی کچھ حد و نہایت ہی نہیں۔ دہن کو چونکہ شاعر معدوم سمجھتے ہیں اس لیے اس شعر میں عدم کا لفظ خاص مناسبت رکھتا ہی ۱۲

سلہ اس شعر میں پرتوِ مہتاب (چاندنی) کو سیلِ آب سے تشبیہ دی ہی۔ مطلب یہ ہی کہ شبِ ہجر کی چاندنی عاشق

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے۔ کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا۔ اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

گر نگاہِ[1] گرم فرماتی رہی۔ تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے۔ خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا۔ ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

وائے۔ گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے۔ کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا؟ سوچ۔ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے۔ جی کا زیاں ہو جائے گا۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا۔ بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اِک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب! کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا[2] وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کے لیے موجب آزار ہوتی ہے ۱۲

[1] نگاہِ گرم = نظرِ عتاب ۱۲

[2] "یادگارِ غالب" میں مولانا حالی نے اس شعر کا یہ مطلب لکھا ہے کہ کیا میری بندگی نمرود کی خدائی تھی۔ جس سے مجھے سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اگر "وہ" کا اشارہ بندگی کی طرف نہ سمجھا جائے بلکہ "وہ"

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے۔ کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا۔ لہو نہ تھما
کام گر رُک گیا۔ روا نہ ہوا

رہزنی ہے۔ کہ دل ستانی ہے!
لے کے دل۔ دل ستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب۔ غزل سرا نہ ہوا!

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گُہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں۔ کہ تو۔ اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں۔ ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے۔ بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ے معشوق کا غرورِ حسن سمجھا جائے تو مطلب دوسرا ہو جاتا ہے ۱۲

۱ مرزا غالب کے وقت میں تھنبا لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اصل نسخہ مطبوعہ ۱۸۶۲ء میں اس لفظ کا یہی املا ہے لیکن زمانۂ موجودہ میں تھنبا متروک ہے۔ تھمنا لکھا جاتا ہے ۱۲۔

۲ شوق کو: اضطرابِ شوق کو، "گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا" دریا گہر میں سما گیا۔ گہر کو دل سے اور شوق کو اضطرابِ دریا سے مشابہت دی ہے ۱۲۔

۳ حنائے پائے خزاں: خزاں کے پاؤں میں لگی ہوئی مہندی کی لالی۔ بہار کی نا پائداری کی طرف یہ اشارہ ہے ۱۲

٤ خندۂ بیجا: خندۂ گُل۔ "گلوں کی ہنسی کسی موقع محل سے نہیں ہوتی اس لیے اُسے خندۂ بے محل سے تعبیر کیا ۱۲۔

ہنوز[1] محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

نہ کہہ[2] کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسدؔ
جفا[3] میں اُس کی ہے اندازِ کارفرما کا

قطرۂ[4] مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا

---

[1] محرمیِ حسن کو ترستا ہوں: یعنی کنہ ذات تک رسائی نہیں۔ دوسرے مصرعے کے شروع میں لفظ "اگرچہ" محذوف ہے۔

[2] حسرتِ دل کو دریا کا منبع (یعنی جمع) کہا گیا ہے۔ اور آنسوؤں کو جو حسرت میں دل سے نکلتے ہیں دریا کے خرچ سے نسبت دی ہے۔

[3] کا۔ فرما معشوق کی طرف اشارہ ہے۔

[4] نفس پرور۔ ساکت۔ اور منجمد۔ خود مرزا نے اپنے ایک خط میں اس شعر کی شرح لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مطلع میں خیال تو دقیق نظم کیا گیا ہے لیکن لطف زیادہ نہیں وہ لکھتے ہیں کہ قطرہ جو ٹپکنے میں بے اختیار ہے افراطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالے کا خط اس تاگے کی صورت بن گیا جس میں موتی

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز[1]
جوہرِ آئینہ کو۔ طوطیِ بسمل باندھا

یاس و امید نے۔ یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ بندھے تشنگیِ ذوق[2] کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مَیں۔ اور بزمِ مے سے۔ یوں تشنہ کام آوٗں
گر مَیں نے کی تھی توبہ۔ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہے ایک تیر۔ جس میں۔ دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے۔ کہ اپنا دِل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالبؔ۔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا۔ ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا۔ جو نہ روتے بھی تو۔ ویراں ہوتا
بحر۔ گر بحر نہ ہوتا۔ تو۔ بیاباں ہوتا

تنگیِ دل کا گلہ کیا۔ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا۔ تو۔ پریشاں ہوتا

پروئے گئے ہوں ۱۲

[1] حیرت کدہ سے مراد آئینہ ہے اور جب آئینہ میں عکسِ یار موجود ہے تو اُس میں شوخیِ ناز کی موجودگی بھی شامل ہوئی۔ اس شوخیِ ناز کی اثر سے جوہرِ آئینہ اہلِ بینش کو طوطیِ بسمل معلوم ہونے لگا۔ [2] تشنگیِ ذوق کے مضمون

بعدِ یک عمرِ ورع - بار تو دیتا - بارے — کاش - رضواں ہی - درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا - کچھ نہ ہوتا - تو خدا ہوتا
ڈبویا - مجھ کو - ہونے - نے - نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا اگر جدا تن سے - تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ **غالب** مرگیا - پر یاد آتا ہی
وہ ہر اک بات پر کہنا - کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

یک ذرۂ زمیں - نہیں بے کار - باغ کا — یاں جادہ بھی - فتیلہ ہی - لالے کے داغ کا
بے مے - کسے ہی - طاقتِ آشوبِ آگہی — کھینچا ہی عجزِ حوصلہ نے - خطِ ایاغ کا

نہ بند سے ۔ ذوقِ سخن کی تشنگی برابر قائم ہی ۔۔
لہ ڈبویا مجھ کو ہونے نے ۔ میری ہستی نے مجھ کو برباد کر دیا ۔۔
کہ جادہ ۔ بٹیا - یعنی روش فتیلہ ۔ بتی - پہلا مصرعہ صاف ہی - یعنی موسم بہار میں ہر جگہ پھول ہی کھلے نظر آتے ہیں - چپہ بھر زمین اس سے خالی نہیں - یہاں تک کہ روشیں بھی گھاس لالہ کی کثرت کی وجہ سے گویا لالے کے داغ کا فتیلہ بنی ہوئی ہیں -
کہ آشوب : شور و غوغا - چونکہ آگہی یعنی ہوش کی حالت میں انسان کا مبتلائے افکار دنیوی ہونا لابدی ہی اس لیے آشوب آگہی کہا گیا - شاعر کہتا ہی کہ آشوب آگہی کا مقابلہ (یعنی افکار دنیوی سے نجات حاصل کرنا) بغیر شراب کے ناممکن ہی لیکن یہاں ہماری پست حوصلگی نے ایاغ (جام شراب) پر خط کھینچ دیا ہی یعنی ایک ساغر سے زاید ساغر بھی وہ جو ایک حد تک بھرا ہوا ہو) یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا -

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہی دماغ کا

تازہ نہیں ہی نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں؟ کہ دل ہی عدو ہی فراغ کا

بے خونِ دل ہی چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ مے کدہ خراب ہی مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

---

[1] دودِ چراغ: [illegible] روشن ۱۲

[2] شاعر کہتا ہی کہ میری آنکھ سے اشکوں کی راہ خونِ دل نہیں آیا اس لیے موجِ نگاہ غبار بن رہی ہی۔ یعنی بغیر خوں فشانی کے گویا خاک اڑ رہی ہی اور یہ مے کدہ یعنی آنکھ مے (خونِ دل) کے تجسس میں خراب ہی ۱۲

[3] بعض شارحین نے "تیرا" کو بساطِ نشاطِ دل کے ساتھ مضاف کیا ہی۔ ہماری رائے میں یہ غلط ہی "تیرا" کا تعلق باغِ شگفتہ سے ہی۔ شاعر اپنے معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہی کہ جب تیرے حسن کا شگفتہ باغ میرے سرورِ دل کا سبب ہی تو ابرِ بہار میری مستی کا باعث نہیں ہو سکتا ۱۲ [4] آئینہ سے مراد سینہ ہی۔ سینے پر الف کھینچا آزادوں کا طریقہ ہی۔ شاعر کہتا ہی کہ جب سے میں نے گریبان کی حقیقت سمجھی ہی میں اسے چاک کر رہا ہوں۔ یعنی جب سے مجھے یہ سمجھنے کا شعور ہوا کہ تعلقاتِ دنیا مانعِ صفائیِ قلب ہیں میں نے انھیں ترک کرنا شروع کر دیا ہی پھر بھی بظاہر آزادوں کے سینہ پر جو الفِ بادہ کھچا ہوا ہوتا ہی۔ اس سے زیادہ ہنوز صفائیِ قلب حاصل نہیں ہی ۱۲ [5] قطرہ عرق بہ نمکِ نہانی

نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
عجز سے اپنے یہ - جانا کہ وہ بدخو ہوگا

ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
سفرِ عشق میں - کی ضعف نے راحت طلبی

دفعِ پیکانِ قضا - اس قدر آساں سمجھا
تھا گریزاں - مژۂ یار سے دل - تا دمِ مرگ

دل دیا - جان کے - کیوں اُس کو - وفادار اسدؔ
غلطی کی - کہ جو کافر کو مسلماں - سمجھا

دل جگر تشنۂ فریاد آیا -
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا -
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا -
سادگی ہائے تمنا - یعنی

استعمال ہوا ہے یعنی قطرۂ عرق - اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق خود اپنے سے بھی بدگمان ہے - اُسے اس بدگمانی نے سرگرمِ خرام نہ ہونے دیا - کیونکہ خرام سے پسینے کی بوندیں اُس کے رُخ پر نمودار ہو جائیں جو عاشق کے دیدۂ حیراں سے مشابہ سمجھی جاتیں ۱۲ -

لہ نبضِ خس : عجز کی نبض (مولانا شاعر نے اپنے عجز کو خس کہا ہے) - تپش : حرارت - شعلۂ سوزاں : معشوق کی بدخوئی - شاعر کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ جس قدر میں عاجزی کروں گا - معشوق کی بدخوئی بڑھے گی اور معشوق کی بدخوئی عاشق کی بربادی کا باعث ہوا کرتی ہے - مطلب یہ ہے کہ میرا عجز اور بھی میری ہلاکت کا سبب ہوگا -

سہ شبستان - رات گزارنے کی جگہ - اس شعر کی ترکیب صاف ہے - اگر استعاروں کو دور کر دیا جائے - تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ انسان غایت ناکامیابی کی حالت میں یاس و نا امیدی ہی سے تسکین و تسلی پانے کا آرزومند ہوتا ہے -

سہ دوسرے مصرعے میں آیا بمعنی ہوا - دل جگر میں حرف عطف محذوف ہے ۱۲ -

سہ پہلے مصرعے میں "دیکھو" محذوف ہے - نیرنگِ نظر - معشوقِ شوخ کی صفت ہے - مطلب یہ ہے کہ پہلے معشوق کے ملنے میں کونسی کامیابی ہوئی جو اب پھر یاد آیا -

عذرِ واماندگی۔ اے حسرتِ دل!
نالہ کرتا تھا۔ جگر یاد آیا

زندگی۔ یوں بھی۔ گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی!
گھر ترا خلد میں گر۔ یاد آیا

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں!
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر۔ یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر۔ یاد آیا

ہوئی تاخیر۔ تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے۔ مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ہے۔ مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اُس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر۔ بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گراں باریٔ زنجیر۔ بھی تھا

[۱] مصرعۂ اوّل کے آخر میں "قبول کرو" محذوف ہے۔ جگر یاد آیا۔ یعنی اپنے جگر کی کمزوری یاد آگئی ۱۲۔

[۲] گھر یاد آیا۔ سے مطلب ہے خوف معلوم ہوا۔ اس شعر میں صنعت ایہام ہے۔ یعنی یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ہمارا گھر اس قدر ویران ہے کہ دشت کی ویرانی اس کی یاد کو تازہ کرتی ہے۔ ۱۲۔

[۳] مجنوں کی بجائے اپنے سر میں پتھر مار لیا ۱۲

[۴] عناں گیر کے لغوی معنی باگ پکڑ کے لے جانے والے کے ہیں۔ یہاں مراد روکنے والے سے ہے ۱۲

[۵] فتراک: تسمے جو زین کے دونوں جانب شکار کے باندھنے کے لیے لٹکائے جاتے ہیں۔ نخچیر بالفتح شکار کرنا

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اُس کو کہوں۔ اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے۔ تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو۔ ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا۔ ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں۔ رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں۔ وہ جوان میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے۔ پاس نہ آیا۔ نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

لبِ[3] خشک۔ در تشنگی مردگاں۔ کا
زیارت کدہ ہوں۔ دل آزردگاں۔ کا

ہمہ[4] ناامیدی۔ ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں۔ فریبِ وفا خوردگاں کا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم۔ کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

اور شکار کی ہوئی چیز اور بھاگا صحرائی مثل آہو وغیرہ ۱۲

[2] مصرعۂ ثانی میں تھا کا فاعل وہ محذوف ہے ۱۲

[3] مصرعۂ اول کے آخر سے "ہوں" محذوف ہے۔ تشنگی استعارہ ہے۔ آرزو و شوق سے مطلب یہ ہے کہ میں گویا لبِ خشک ہوں اُن لوگوں کا جو آرزو و شوق میں مر گئے اور میں گویا زیارت گاہ ہوں آزردہ دل لوگوں کا۔ اِس شعر میں اظہار ناکامی کا بیان کیا گیا ہے ۱۲-

[4] فریبِ وفا خوردگاں: جو لوگ وفا کا فریب کھائے ہوئے ہیں ۱۲-

چھوڑا[1] مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے — خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم — میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

میں[2] سادہ دل۔ آزردگیِ یار سے خوش ہوں — یعنی۔ سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا

دریائے[3] معاصی۔ تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی۔ ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری[4] تھی اسدؔ۔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ۔ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

[1] ماہِ نخشب:۔ وہ مصنوعی چاند جس کو مقام نخشب میں حکیم نخشی مشہور بہ ابن مقنع نے تیار کیا تھا۔ یہ چاند ایک کنوئیں سے نکلا کرتا تھا۔ لیکن روشنی اُس کی چار فرسنگ سے زیادہ نہ پھیلتی تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ روے معشوق کے مقابلہ میں خورشید بھی ماہِ نخشب کی طرح ناقص ہے ۱۲

[2] اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ یار اظہارِ شوق سے آزردہ ہو گیا۔ میں سادہ دل اس لیے خوش ہوں کہ اظہارِ شوق کا سبق ہنوز ایک ہی بار پڑھا تھا اس کی تکرار کی نوبت نہیں پہونچی تھی اگر یار آزردہ نہ ہو جاتا تو تکرار کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اب تکرارِ سبق کا موقع خوب ملا ۱۲۔

[3] معاصی:۔ جمع معصیت گناہ۔ تنک آبی:۔ پانی کی کمی تر دامن گنہگار کو کہتے ہیں۔ شعر کے معنی یہ ہیں کہ میں اس درجہ کا گنہگار ہوں کہ باوجودیکہ دنیا کے گناہوں کا دریا پانی کی کمی کی وجہ سے خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلہ تک تر نہ ہوا ۱۲

[4] سمندر:۔ بڑے چوہے کی برابر ایک جانور کو کہتے ہیں جو پرانے آتشکدہ میں جہاں مدت دراز تک آگ جل چکی ہو پیدا ہوتا ہے اور آگ ہی سے اس کی زندگی وابستہ ہے۔ آگ سے جدا ہونے پر وہ مرجاتا ہے۔ زمانۂ حال کی تحقیقات علم الحیوانات میں اس جانور کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عنقا کی طرح صرف شاعروں کے خیال ہی میں اس کا وجود ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آتش کدہ اُس زمانے سے میرے داغِ جگر سے آتش مزاجی کی تحصیل کرتا تھا جب کہ اس سمندر کا وجود بھی نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ آتش اور آتش کدہ اور سمندر شاعر ہی کے داغِ جگر سے پیدا ہوئے ہیں ۱۲۔

شب[1] کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یا رب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل[2] بہ دل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا[3] خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عرضِ نیاز[4] عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل[5] نہیں رہا

[1] رشتۂ شمع:- موم بتی میں جو تاگا ہوتا ہے اسے رشتۂ شمع کہا گیا ہے۔ کسوت:- پیراہن۔ خارِ کسوت تھا:- بے چین تھا۔ فارسی کے محاورہ میں خار در پیراہن بودن کے معنی بے چین ہونے کے ہیں۔ غالب نے اسی فارسی محاورے کو اردو میں لیا ہے۔ کسوتِ فانوس اس لیے کہا کہ پہلے زمانے میں لوہے کی قندیل بنا کر اس پر کپڑا چڑھاتے تھے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کے خلوت خانے میں اُس کے دید سے شمع بے چین و بے قرار تھی ۱۲۔

[2] دل بہ دل پیوستہ:- معشوق کے دل سے دل ملا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ محبت کا نتیجہ مایوسی کے سوا اور کچھ نہ دیکھا۔ اگر معشوق کے دل سے دل بھی ملا تو کیا۔ وصل کی حالت بھی لبِ افسوس بن گئی ۱۲

[3] کیموس:- اصطلاحِ طب میں ہضمِ جگری کو کہتے ہیں جس میں غذا ہضم ہو کر خون بن جاتی ہے ۱۲

[4] نیاز:- نیازمندی ۱۲

[5] محفل:- استعارہ ہے ہستی سے ۱۲۔

مرنے کی اے دل۔ اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت۔ در آئینہ باز ہے
یاں[۱] امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

واکر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا۔ رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل[۲] سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے۔ وہ دل نہیں رہا

رشک کہتا ہے۔ کہ اُس کا غیر سے اخلاص۔ حیف!
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرہ[۳] - ذرہ - ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے۔
گردشِ مجنوں۔ بہ چشمک ہائے لیلیٰ۔ آشنا

[۱] ہر شخص کے سامنے۔ شاعر اس شعر میں زمانہ کی ناقدرشناسی کا شاکی ہے جس طرح بقول عکس میں امتیاز نہیں کرتا۔ اسی طرح زمانہ ناقص وکامل میں فرق نہیں کرتا ۱۲

[۲] ہوئے کشتۂ وفائے آرزوئے وفا مراد ہے اور دل اشارہ ہے اسی کشت وفا کی طرف ۱۲

[۳] یعنی دنیا کا ہر ایک ذرہ جو گردش وانقلاب میں مبتلا ہے اس کی یہ گردش نیرنگ فلک کے اشارے سے ہے جس طرح سے مجنوں کی گردشِ چشم ہائے لیلیٰ کے اشارہ کے پابند تھی۔ دوسرا مصرعہ بر سبیل تمثیل بطور تشریح مصرعۂ اول کہا گیا ہے ۱۲

۱ شوق ہی۔ ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ۔ صحرا دست گاہ۔ و۔ قطرہ۔ دریا آشنا

۲ میں۔ اور اِک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی۔ کہ ہی
عافیت کا دشمن۔ اور۔ آوارگی کا آشنا

بشکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیئے
میرا۔ زانو مونس۔ اور۔ آئینہ۔ تیرا آشنا

۳ ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں۔ اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ۔ صبا آوارہ۔ گل نا آشنا

۴ کوہکن۔ نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر۔ ہووے نہ پیدا۔ آشنا

ذکر اُس پری وش کا۔ اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب۔ آخر۔ تھا جو رازداں اپنا

---

۱ شوق = عشق۔ اربابِ عجز یعنی عشاق کے حق میں اِن کا عشق ہی نازش کے سامان پیدا کر دیتا ہے اور ان کو اپنے عجز پر ناز کرنے کا حوصلہ دلاتا ہی۔ کیونکہ ذرہ مل کر صحرا پیدا ہوتے ہیں اور قطرہ قطرہ بہم ہو کر دریا ہو جاتا ہی ۱۲

۲ میں کے بعد لفظ "ہوں" محذوف ہی۔

۳ یہ شعر تمام مطبوعہ دیوانوں میں نہیں ہی ۱۲۳۲ھ کے لکھے ہوئے قلمی دیوان میں سے لیا گیا

۴ فرہاد چاہتا تھا کہ پتھر کو تراش کے شیریں کی ایک تمثال بنائے لیکن وہ ایسا بھی نہ کر سکا۔ شاعر طنزیہ کہتا ہی کہ بھلا کہیں پتھروں سے سر پھوڑنے سے معشوق پیدا ہوا کرتے ہیں مطلب یہ ہی کہ شاعر کے نزدیک فرہاد کا عشق کامل نہ تھا۔

ؔلہ ؔؔوہ کیوں بہت پیتے۔ بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا؟

منظر اِک بلندی پر۔ اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا۔ کاش کے مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلّت۔ ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے۔ آشنا نکلا اُن کا پاسباں۔ اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں اُن کو دکھلا دوں
اُنگلیاں فگار اپنی۔ خامہ خوں چکاں اپنا

گھستے گھستے مِٹ جاتا۔ آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے۔ سنگِ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمّازی۔ کر لیا ہی دشمن کو
دوست کی شکایت میں۔ ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے۔ کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب۔ ہوا۔ **غالب**۔ دشمن آسماں اپنا

لہ شاعر تعجب سے کہتا ہی کہ بزمِ غیر میں اُنھیں نے کثرت سے شراب کیوں پی۔ کیا اُنھیں اپنے استقلال اور خودداری کا امتحان منظور تھا؟ استفہام انکاری ہی۔ مطلب یہ ہی کہ امتحان منظور نہ تھا۔ بلکہ شراب کے نشے سے بے تکلف ہونا مدِنظر تھا ۱۲

سرمۂ مفتِ نظر ہوں - مری قیمت یہ ہی
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

رخصتِ نالہ مجھے دے - کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

غافل - بہ وہمِ ناز - خود آرا ہی - ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طُرّہ گیاہ کا

بزمِ قدح سے - عیش تمنّا نہ رکھ - کہ رنگ
صیدِ[1] ز دام جستہ ہی - اس دام گاہ کا

رحمت اگر قبول کرے - کیا بعید ہی؟
شرمندگی سے - عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو - کس نشاط سے جاتا ہوں میں - کہ ہی
پُرگُل[2] - خیالِ زخم سے - دامن نگاہ کا

جاں - در ہوائے یک نگہِ گرم ہی - اسدؔ
پروانہ ہی وکیل - ترے داد خواہ کا

[1] صیدِ ز دام جستہ = دام سے نکلا ہوا شکار - بزمِ عیش کے رنگ کو شاعر نے صید ز دام جستہ کہا ہی - مطلب یہ ہی کہ اس بزمِ عیش کا رنگ ایسا شکار ہی جو کسی کے قبضہ میں نہیں رہ سکتا - عیش دنیا کی ناپائداری کی طرف اشارہ ہی ۱۲

[2] پُرگُل = پھولوں سے بھرا ہوا - زخم کو پھول سے شباہت دی ہی - مقتل کو میں خوش خوش شوقِ شہادت میں جا رہا ہوں - جنوں کی بہار میری نظر میں سمائی ہوئی ہی ۱۲

[3] ہوا = شوق آرزو - نگہ گرم = نظرِ محبت - مطلب یہ ہی کہ اسد کی جان یک نگاہِ محبت کی آرزو میں ہو گیا

جور سے باز آئے پر[۱] - باز آئیں کیا؟
کہتے ہیں "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟"

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ - گھبرائیں کیا؟

لاگ ہو - تو اس کو ہم سمجھیں - لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی - تو دھوکا کھائیں کیا؟

ہو لیے کیوں - نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب - اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟

موجِ خوں - سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گیے پر - دیکھیے - دکھلائیں کیا؟

پوچھتے ہیں وہ - کہ "غالب کون ہے؟"
کوئی بتلاؤ - کہ - ہم بتلائیں کیا؟

لطافت[۲] - بے کثافت - جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے - آئینۂ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں - خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو - باطل ہے - دعویٰ ہوشیاری کا

وہ تیری اک نگاہِ گرم پر جان دینے کو تیار ہے اور اس مقصد کے لیے تیری بزم میں اُس نے پروانے کو اپنا وکیل کر دیا ہے (پروانہ بھی شمع کے عشق میں اپنی جان دے دیتا ہے) ۱۲

لہ پر - لیکن ۱۲

سے بغیر کثافت کے لطافت جلوہ گر نہیں ہو سکتی - مطلب یہ ہے کہ بے تعلق مادہ جلوہ مجردات نہیں ہو سکتا - دوسرے مصرعے میں اس بیان کا مثالی ثبوت دیا گیا ہے - یعنی بادِ بہاری کے جلوے کے نمودار ہونے کا چمن ہی ذریعہ ہوتا ہے ۱۲

[۱] عشرتِ قطرہ ہے- دریا میں فنا- ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے- دوا ہو جانا

[۲] تجھ سے- قسمت میں مری- صورتِ قفلِ ابجد — تھا لکھا- بات کے بنتے ہی- جدا ہو جانا

[۳] دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام — مٹ گیا گھسنے میں- اس عقدہ کا- وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم- اللہ اللہ — اس قدر- دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

[۴] ضعف سے- گریہ- مبدل بہ دمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال — ہو گیا- گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا- برس کر کھلنا — روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس — کیوں ہے؟ گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ[۵] ہوائے صیقل — دیکھ- برسات میں- سبز آئینے کا ہو جانا

---

[۱] درد جب حد سے گزرتا ہے- مریض فنا ہو جاتا ہے- یعنی مریض کو موت کے آجانے سے درد کی تکلیف سے نجات ہو جاتی ہے- اور وہ جس حالت سے یہاں آیا تھا اُسی کی طرف سدھار جاتا ہے گویا جز اپنے کل ہی میں مل جاتا ہے اور یہی انسانی ہستی کا عین مقصد ہے جس طرح قطرہ کا دریا میں مل جانا اس کا مقصد اور اُس کے لیے باعث مسرت ہے

[۲] قفلِ ابجد: وہ قفل جس میں حلقوں پر حروف ابجد ثبت ہوتے ہیں- اور جس وقت تک ان سب حروف کے ترتیب پانے سے وہ کلمہ جو واضع نے مقرر کر دیا ہے نہیں بن جاتا قفل نہیں کھلتا- بات بننا بہ تدبیر پوری اُترنا ۱۲

[۳] زحمت دل کے دور کرنے کی اس قدر کوشش کی گئی کہ دل ہی تمام ہو گیا- گویا ایک گرہ تھی جو گھس گئی-

[۴] مسئلہ استحالہ عناصر جس کو حکمائے جدید مانتے ہیں غالب سے بھی پوشیدہ نہ تھا- اس شعر میں اسی مسئلہ کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے ۱۲-

[۵] ہوائے صیقل بعض شارحین ہوا بمعنی خواہش کہتے ہیں اور بعض نے اصلی ہوا سے مراد لی ہے- مطلب یہ ہے کہ موسم برسات میں آئینہ فولاد پر بھی زنگ آجاتی ہے وہ گویا سبزہ ہے جس کو ہوائے صیقل نے پیدا کیا ہے ۱۲-

بخشے ہی جلوۂ گل - ذوقِ تماشا - غالب
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ردیف (ب)

پھر ہوا وقت - کہ ہو بال کشا - موجِ شراب
دے بطِ مے کو - دل و دستِ شنا - موجِ شراب

پوچھ مت - وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے - ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے - بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی - ہے بالِ ہُما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم - کہ عجب کیا ہے؟ اگر
موجِ ہستی کو - کرے فیضِ ہوا - موجِ شراب

سلہ اے غالب جلوۂ گل ذوقِ تماشا بخشتا ہے - دوسرے مصرعہ میں ذوقِ تماشا کی تفسیر بیان کی گئی ہے ۱۲

سلہ موجِ شراب بال کشا ہو: موجِ شراب اپنا بازو کھولے یعنی دورِ شراب شروع ہو - بطِ مے: شراب کی صراحی جو بطخ کی شکل ہو - دل و دست شنا: شناوری کا دل و دست یعنی پیراکی کی قوت ۱۲

سلہ: اربابِ چمن: باغ کے درخت اور پودے ۱۲ -

سلہ موجِ شراب کا سر سے گزرنا: نشۂ مے کا حد سے گزر جانا ۱۲

* * *

جس[1] قدر روحِ نباتی ہی۔ جگر تشنۂ ناز
دے ہی تسکیں۔ بدمِ آبِ بقا۔ موجِ شراب

بس کہ دوڑے ہی۔ رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے۔ ہی بال کُشا۔ موجِ شراب

موجۂ گُل[2] سے۔ چراغاں ہی گزرگاہِ خیال
ہی تصوّر میں زبس۔ جلوہ نما۔ موجِ شراب

نشّے[3] کے پردے میں ہی محوِ تماشائے دماغ
بس کہ رکھتی ہی سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ[4] کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے۔ تا۔ موجِ شراب

---

[1] روحِ نباتی:۔ قوتِ نامیہ۔ یعنی وہ قوت جس سے نباتات اور حیوانات بڑھتے ہیں۔ جگر تشنہ: مشتاق۔ جگر تشنۂ ناز یعنی مشتاقِ ناز۔ ناز سے یہاں اینڈنا اور تننا مراد ہی۔ جو نشو و نما کا لازمہ ہی۔ مطلب یہ ہی کہ جس قدر قوتِ نمو مشتاقِ ناز ہی اُسی قدر موجِ شراب آبِ حیات بن کر اُس کو سیراب کرتی ہی۔ یعنی شراب سے قوتِ نمو کے حسن اور اُس کے ناز میں ترقی ہوتی ہی ۱۲۔

[2] موجۂ گُل:۔ موجِ شراب کو موجِ گُل سے نسبت دی گئی ہی۔ ہجومِ گُل کو چراغاں سے مشابہ کیا ہی ۱۲

[3] "پردہ میں ہی" کا فاعل موجِ شراب ہی۔ سرِ نشو و نما:۔ دماغ کے نشو و نما کا خیال ۱۲۔

[4] طوفانی:۔ جوش و خروش کا اظہار کرنے والی۔ فصل سے موسمِ بارش مراد ہی۔ مطلب یہ ہی موسمِ برشگال کی طوفانی کیفیت موجِ سبزہ اور موجِ شراب پر یکساں اثر کر رہی ہی ۱۲۔

۱ شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے - زہے موسمِ گل
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے - خوشا موجِ شراب

۲ ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت - کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ردیف (ت)

۳ افسوس - کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

کافی ہے نشانی تری - چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخن گرم
تا - رکھ نہ سکے کوئی - مرے حرف پر انگشت

۱ موسمِ گل کیا اچھا ہے کہ ہنگامۂ ہستی کی شرح ہے چونکہ موسمِ گل بھی ہنگامۂ ہستی کی مانند خوشگوار، و چند روزہ ہے اس لیے اسے شرح کہا گیا۔ اور موجِ شراب کیا ہی اچھی چیز ہے کہ دریا میں قطرہ کے ملانے کی رہبر ہے۔ چونکہ فنا قطرہ کو دریا سے ملا دیتی ہے۔ اس لیے شراب کی بے خودی کو جو فنا سے مشابہ ہے قطرے کو دریا میں ملانے کا رہبر کہا گیا ہے۔

۲ دیکھ بمعنی دیکھ کر۔ ۳ جن لوگوں کی انگلیاں اس قابل تھیں کہ موتیوں کی لڑی بنجائیں یعنی وہ لوگ متمول و آسودہ حال ہوتے اب وہ دانتوں کا رزق بن گئی ہیں۔ یعنی اب وہ دندان حسرت سے اپنی انگلیاں کاٹ رہے ہیں۔ "انگشت بہ دنداں" فارسی کا ایک محاورہ ہے شاعر نے اسی محاورہ سے اس خیال کو لیا ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اہلِ کمال افلاس کی حالت میں بسر کر رہے ہیں۔ **نوٹ**:۔ ایک شارح نے دنداں کو دیاں پڑھ کر شرح کی ہے حالانکہ

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے۔ حضرت سلامت

جگر کو مرے۔ عشقِ خوں نابہ مشرب
لکھے ہے خداوندِ نعمت! سلامت

علی الرغمِ دشمن۔ شہیدِ وفا ہوں
مبارک۔ مبارک۔ سلامت۔ سلامت

نہیں گر۔ سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے۔ پر۔ کس وقت!

آمدِ خط سے ہُوا ہے سرد۔ جو۔ بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا۔ شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش۔ ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست؟

خانہ ویراں سازیِ حیرت۔ تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں۔ رفتۂ رفتارِ دوست

تصحیح: نسخے میں دزان ہے انھوں نے دیدان کو دود کی جمع الجمع لکھا ہے اور دود کیڑے کو کہتے ہیں ۱۲

سلہ علی الرغم۔ برخلاف دیر عکس رغم کے لغوی معنی خاک میں آلودہ ہونے کے ہیں، اس شعر میں خلاف خواہش رقیب شہید وفا ہونے پر مبارکباد دی گئی ہے۔

سلہ سر و برگ: سامان سفر۔ مطلب یہ ہے اگر ہم عالم معنی کا ادراک نہیں کر سکتے تو تماشائے صورت ہی سہی۔ ۱۲

سلہ خطِ رخسار۔ دوست کو دودِ شمع کشتہ سے مشابہ کیا گیا ہے ۱۲ سلہ خانہ ویراں سازیِ حیرت: خانہ ویرانی جو

عشق میں - بیدادِ رشکِ غیر - نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر - گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن - کہ اُس بے درد کا دل شاد ہی
دیدۂ پرخوں ہمارا - ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہی میری پرسش اُس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی - غمخوارِ دوست

تا کہ میں جانوں - کہ ہی اُس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہی - پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہی - وہ - حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہی اگر
ہنس کے کرتا ہی - بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے؟
یا بیاں کیجے - سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہی آپ
ہی ردیفِ شعر میں غالبؔ - ز بس تکرارِ دوست

جو حیرت کے ہاتھوں ہوئی - رفتۂ رفتارِ دوست : رفتارِ دوست کا وارفتہ یعنی شیدا ۱۲

ردیف (ج)

[۱]گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہی آج
قمری کا طوق۔ حلقۂ بیرونِ در ہی آج

آتا ہی ایک[۲] پارۂ دل۔ ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس۔ کمندِ شکارِ اثر۔ ہی آج

اے عافیت کنارہ کر۔ اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہی آج

لو ہم مریضِ عشق کے بیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو۔ تو مسیحا[۳] کا۔ کیا علاج؟

ردیف (چ)

[۴]نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں۔ انتظارِ ساغر کھینچ

[۱] حلقۂ بیرونِ در: مجازاً وہ شخص جسے اندر آنے کی اجازت نہ ہو۔ مطلب یہ ہی کہ باغ میں آج ایسی روک ٹوک ہی کہ قمری تک کا گزر نہیں ۱۲

[۲] آج ہر تارِ نفس اثر کے شکار کرنے کو ایک کمند بنا ہوا ہی یعنی بدنصیبی سے اُلٹا اثر ہو رہا ہی کہ ہر آہ کے ساتھ ایک پارۂ دل باہر آتا ہی ۱۲

[۳] کیا علاج: کیا سزا ۱۲۔

[۴] نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ: ترک آرزو نہ کر ۱۲

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ[1] دید۔ نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

تجھے[2] بہانۂ راحت ہے۔ انتظار۔ اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ؟ کہ نازِ بستر کھینچ

تری[3] طرف ہے بہ حسرت۔ نظارۂ نرگس
بکوریِ دل وچشمِ رقیب۔ ساغر کھینچ

بہ نیم[4] غمزہ۔ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے۔ صہبائے آتش پنہاں[5]
بروئے سفرہ۔ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

[1] تلاش بروزن خراش :۔ بمعنی سعی وجستجو۔ یہ لفظ ترکی ہے اسی وجہ سے اس کا اسم فاعل تلاش کرنے والے کے معنی میں متلاشی جیسا عوام بولتے ہیں غلط ہے تلاشی صحیح ہے ۱۲
غالب کا یہ شعر ان مشکل اور پیچیدہ اشعار میں سے ہے جن کا مطلب سمجھنے میں اہل فن مختلف الرائے ہیں۔ شاعر کہتا ہے اے مخاطب میری سرگرمیِ تلاشِ دید یعنی کمال اور فن کے قدر دانوں کی تلاش کی کوشش کا تو ذکر نہ کر کیونکہ وہ تو ملتے ہی نہیں، بہتر یہ ہے کہ میرے آئینۂ دل سے تو کانٹے کی طرح سے جوہر کو نکال لے یعنی ایسی تدبیر کر کہ میرا کمال ہی مجھ سے سلب ہو جائے۔ شاعر زمانے کی شکایت کرتا ہے اور یہ دکھلاتا ہے کہ اس زمانے میں اہل کمال کی قدر نہیں بلکہ نا قابل پوچھے جاتے ہیں اس لیے وہ حسرت کے ساتھ اپنے کمال کے سلب ہو جانے کی تمنا کرتا ہے ۱۲

[2] نازِ بستر کھینچنا :۔ بستر پر پڑے پڑے بیٹھ کا انتظار کرنا شاعر اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو جو معشوق کے انتظار کے حیلے سے بستر پر پڑا ہوا ہے یہ تیری آرام طلبی ہے ورنہ معشوق کی طرف سے اشارہ بھی نہیں ہوا ہے۔ ۱۲

[3] چونکہ نرگس معشوق کی طرف۔ حسرت کے ساتھ نظارہ کناں ہے۔ اس لیے شاعر نے اس کو اپنا رقیب کہا ہے اور عاشق کو اپنے معشوق کی طرف رقیب کا گھورنا گوارا نہیں ہو سکتا۔ پس شاعر اس کے اندھے ہو جانے کی خواہش کا اظہار اپنے معشوق پر نہایت لطیف پیرایہ میں کرتا ہے اور معشوق سے کہتا ہے کہ تو شراب رقیب کے دل وچشم کی کوری پر یعنی اس کے اندھے پن کی خواہش کی یاد میں ساغر پی دستور ہے کہ شراب کسی کی یاد پر پیتے ہیں چنانچہ جام صحت وغیرہ کی رسم مغربی تہذیب میں ابھی جاری ہے ۱۲

[4] نیام :۔ تلوار کا غلاف یعنی میان۔ شاعر اپنے معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے خنجرِ ناز کو میں نے مدتوں زخمِ جگر کے پردہ میں امانت رکھا ہو پردۂ زخمِ جگر کو خنجرِ ناز کا نیام قرار دیا ہے اب تو اپنے خنجرِ ناز کو میرے زخمِ جگر سے نکال لے اور اس امانت کا معاوضہ نیم غمزہ سے ادا کر یعنی نیم وا آنکھوں سے ایک نظر مجھے دیکھ لے غمزہ کے معنے آنکھ سے اشارہ کرنے کے ہیں اس لیے نیم وا آنکھوں کے اشارہ کے لیے "نیم غمزہ" غالب نے استعمال کیا ہے۔ نہایت بلیغ مضمون ہے ۱۲

[5] میرے جامِ دل میں آتشِ پنہاں یعنی عشق کی شراب تلخ بھری ہوتی ہے شراب سرخ ہوتی ہے، وہ آگ کا رنگ بھی سرخ ہوتا ہے شراب کی

ردیف (د)

حُسن۔ غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد
بارے۔ آرام سے ہیں۔ اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے۔ تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک[1] میں۔ احوالِ بتاں پر۔ یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

درخورِ عرض[2] نہیں۔ جوہرِ بیداد کو۔ جا
نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

گرمی اور آگ کی گرمی سے بھی مناسبت ہے) بس ضرورت ہے کہ دسترخوان پر سمندر کے دل کے کباب بھی چنے جائیں۔ سمندر کے دل کے کباب اس لیے کہے گئے کہ دل اچھا بھنا ہوتا ہے۔ چونکہ شراب بھی جیسی ہوئی آگ کے مانند ہے اس لیے اس کے میل کے لیے سمندر (ایک جانور ہوتا ہے جو آتشکدہ میں رہتا ہے اور جب آگ سے باہر آتا ہے مر جاتا ہے) کے دل کے کباب شاعر نے طلب کیے ہیں۔ کھینچ فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے۔ اردو میں دسترخوان پر کھانے کے لیے کھینچنا نہیں بولتے بلکہ کھانا لگانا یا چننا بولتے ہیں۔ اس شعر میں صرف الفاظ کی خوبی رکھی گئی ہے۔ ۱۲

[1] خاک میں ہے یعنی قبر میں۔ مطلب یہ ہے کہ قبر میں پڑا پڑا میرا دل احوالِ بتاں پر افسوس کر رہا ہے کہ انھوں نے میرے سوگ میں مہندی لگانا چھوڑ دی ہے۱۲۔ [2] درخورِ عرض در اظہار کے قابل۔ شاعر کہتا ہے کہ جوہرِ بیداد کے اظہار

ہو جنوں - اہلِ جنوں[۱] کے لیے - آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہو گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہو حریفِ مَے مرد افگنِ عشق؟[۲]
ہو مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم[۳] سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے[۴] ہو بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

کے لیے اب کوئی مناسب جگہ باقی نہیں رہی اس لیے معشوق کی نگاہِ ناز سرمے خفا ہو - یعنی اس نے میرے بعد سرمہ لگانا چھوڑ دیا - کیونکہ میں تو ہوں ہی نہیں اب سرمہ لگا کر نشانۂ بیداد کس کو بنایا جائے ۱۲ -

[۱] آغوشِ وداع ہو یعنی رخصت ہو رہا ہو شاعر کہتا ہو کہ میرے بعد جنوں اہلِ جنوں سے رخصت ہو رہا ہو - اور چاک گریباں سے جدا ہوتا ہو مطلب یہ ہو کہ میں نے جنوں اور چاک گریباں کا قصہ ہی تمام کر دیا -

[۲] اس شعر میں لفظ "مکرر" نے عجیب خوبی پیدا کر دی ہو - اولاً مصرعہ اول کو سوالیہ لہجے میں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ معشوق کہتا ہو کوئی ہو جو مَے مرد افگن عشق کا حریف ہو؟" یعنی کوئی ہو جو غالب کی برابری کرے لیکن جب کوئی اس آواز پر سامنے نہیں آتا تو پھر وہ مایوسانہ لہجے میں کہتا ہو" کون ہوتا ہو حریفِ مے مرد افگن عشق" یعنی کوئی نہیں ہوتا ۱۲

[۳] شاعر کہتا ہو کہ مرنے سے پہلے مجھے اس بات کا غم ہو کہ میرے بعد کوئی مہر و وفا کی ہمدردی کرنے والا بھی باقی نہ رہے گا یعنی مہر و وفا کا میرے بعد خاتمہ ہو جائے گا ۱۲ -

[۴] مصرعہ ثانی میں سیلابِ بلا سے عشق مراد ہو شاعر کہتا ہو کہ اس کے مرنے کے بعد عشق کا قدر شناس کوئی دنیا میں باقی نہ رہیگا کیونکہ وہ سیلاب بلا ہو اور اس لیے سوا غالب کے ایسا کون جواں مرد ہو جو اس بلا کو اپنے گھر مہمان بنانا پسند کرے ۱۲

ردیف (ر)

بلا سے - ہیں جو یہ پیشِ نظر - در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں - بال و پر - در و دیوار

وفورِ اشک[۱] نے - کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در - در و دیوار

نہیں ہے سایہ[۲] - کہ سن کر نوید مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر - در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مئے جلوہ !
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر - در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار - تو - آ
کہ ہیں - دکانِ متاعِ نظر - در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے ؟
کہ گر پڑے - نہ مرے پاؤں پہ در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسائے میں - تو سائے[۳] سے
ہوئے فدا در و دیوار پر - در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم - دیکھ کر - در و دیوار

نہ پوچھ[۴] بے خودیِ عیش - مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے - سر بسر در و دیوار

---

۱ دیوار و در - در و دیوار ہو گئے - لفظوں کا یہ الٹ پھیر نہایت با مزہ ہے - مطلب یہ ہے کہ دیوار مسمار ہو کر دروازہ کا کام دینے لگی یعنی جہاں پر دیوار کھڑی نظر آتی تھی وہاں راستہ چلنے لگا اور دروازہ کے منہدم ہونے سے اس کی مٹی کا انبار بطور دیوار کے ہو گیا ہے ۱۲

۲ سایہ - در و دیوار کا سایہ - ہر چیز کا سایہ اس سے آگے بڑھتا ہے - شاعر کہتا ہے کہ میرے در و دیوار کا سایہ جو اس سے آگے بڑھ کر پڑتا ہے - گویا یہ در و دیوار ہیں جو یار کے استقبال کے لیے چند قدم آگے کو بڑھ گئے ہیں ۱۲-

۳ سایہ سے - بذریعۂ سایہ ۱۲

۴ سیلاب کی آمد کا نتیجہ خانہ ویرانی ہوا کرتا ہے - شاعر اس کو اپنے بیخودیِ عیش سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ۔ نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت۔ مگر۔ در و دیوار

گھر جب بنا لیا ترے در پر۔ کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
کام اُس سے آپڑا ہے۔ کہ جس کا جہان میں
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا
مقصد ہے ناز و غمزہ۔ ولے گفتگو میں کام
بہرا ہوں میں۔ تو چاہیے۔ دونا ہو التفات

جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر؟ کہے بغیر
"جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر؟"
لیوے نہ کوئی نام ستمگر۔ کہے بغیر
سر جائے یا رہے۔ نہ رہیں پر۔ کہے بغیر
چھوڑے نہ خلق۔ گو۔ مجھے کافر کہے بغیر
بنتی نہیں ہے۔ بادہ و ساغر۔ کہے بغیر
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

غالبؔ۔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر؟
آتش پرست کہتے ہیں۔ اہلِ جہاں مجھے
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا

جلتا ہوں۔ اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
رکتا ہوں۔ تم کو بے سبب آزار۔ دیکھ کر

سیلاب کی آمد سے در و دیوار کے گرنے کو وہ رقص سمجھتا ہے۔ رقص کو عیش سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے ۱۲

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پانوں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

لہ جوشِ رشک سے مرتا ہوں: یعنی تلوار کی اس خوش قسمتی پر کہ وہ معشوق کے ہاتھ میں ہے رشک کرتا ہوں ۱۲

لہ جب تو شراب پی کر چلتا ہے تو تیری رفتارِ مستانہ کو دیکھ کر موجِ مے کو رعشہ آجاتا ہے اس بات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خونِ خلق کا باعث یہی شیشۂ شراب ہے نہ تو شراب پیتا نہ تیری رفتارِ مستانہ سے خلق کا خون ہوتا

لہ اپنے معشوق کی انتہائے بدگمانی کو بیان کرتا ہے مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ میرے آئینۂ دل میں زنگار

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں۔ اُس زمانے سے

کہ۔ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے!

بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

لہ نہیں اقلیمِ الفت میں۔ کوئی طومارِ ناز ایسا

کہ پشتِ چشم سے جس کی نہ ہووے مُہر عنواں پر

مجھے۔ اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ۔ یاد آیا

کہ فرقت میں تری۔ آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز۔ کیا باقی رہا ہوگا؟

قیامت اِک ہوائے تُند ہے۔ خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب۔ کیا ہوا؟ گر اُس نے شدت کی

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

یعنی حسرت و مایوسی کو دیکھ کر وہ طوطی کا عکس سمجھتا ہے یعنی کسی دوسرے معشوق کی محبت کو اس مایوسی کا باعث سمجھا بیٹھا ہے حالانکہ یہ یاس و افسردگی خود اس کی لاپروائی اور بے مہری کی پیدا کی ہوئی ہے ۱۲

لہ طومار: دفتر۔ پشتِ چشم سے شاعر نے اغماض و تغافل مراد لیا ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دفتر کے لوازمات میں مہر کا ہونا دقیق سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ناز اور تغافل لازم و ملزوم ہیں ۱۲

ہے بس کہ۔ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت۔ تو گزرتا ہے گُماں اور

یارب۔ وہ نہ سمجھے ہیں۔ نہ سمجھیں گے۔ مری بات
دے اور دل اُن کو۔ جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر۔ مگر اُس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو۔ تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے۔ جا کر۔ دل و جاں اور

ہر چند سُبک دست[1] ہوئے۔ بُت شکنی میں
ہم ہیں۔ تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی۔ دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں۔ اس آواز پہ۔ ہر چند۔ سر اُڑ جائے
جلّاد کو۔ لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں۔ اک داغِ نہاں اور

[1] سبک دست: مشاق۔ "ہم ہیں": یہ سمجھنا کہ "ہم ہیں"۔ خدا رسی کی راہ میں ایک چٹان سے مثل حائل ہو۔ شاعر کا مطلب یہ ہو کہ [illegible] منزلِ عرفان تک پہنچنے کے سبب خودی کو مٹا دینے کی ضرورت ہے۔

لیتا[1] نہ اگر دل تمہیں دیتا - کوئی دم چین
کرتا - جو نہ مرتا - کوئی دن - آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ - تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہی مری طبع - تو ہوتی ہی رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں - کہ "غالب کا ہی انداز بیاں اور"

صفائے حیرتِ آئینہ ہی - سامانِ زنگ آخر
تغیّر آبِ[2] برجاماندہ کا - پاتا ہی رنگ - آخر

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا - جامِ زمرّد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

جنوں کی دست گیری کس سے ہو ؟ گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہی میری گردن پر

---

[1] اس شعر میں تعقید لفظی واقع ہوئی ہی اور اسی نے شعر کو پُر لطف بنا دیا ہی مرزا ایک خط میں اس کے متعلق لکھتے ہیں "یہ بہت لطیف تقریر ہی لیتا کو ربط ہی چین سے کرتا مربوط ہی آہ و فغاں سے - عربی میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معیوب ہیں فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح اور بلیغ - ریختہ تقلید ہی فارسی کی - حاصل معنی مصرعین یہ ہی کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا - اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا" ۱۲

[2] آبِ برجاماندہ : - ایک جگہ ٹھہرا ہوا پانی - مطلب یہ ہی کہ جس طرح ایک جگہ ٹھہرے ہوئے پانی کا تغیر ایک رنگ پیدا کرتا ہی یعنی اُس پر کائی جم جاتی ہی - اسی طرح آئینہ کی صفائی پر حیرت سے زنگ پیدا ہو جاتا ہی وحشت تو ہر طرح چین سے

برنگِ کاغذِ آتش زدہ - نیرنگ بے تابی[1]

ہزار آئینۂ دِل باندھے ہے - بالِ یک تپیدن پر

فلک سے[2] ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے؟

متاعِ بردہ کو - سمجھے ہوئے ہیں - قرض - رہزن پر

ہم - اور - وہ[3] بے سبب رنج - آشنا دشمن - کہ رکھتا ہے

شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ کر - مشتاق ہے اپنی حقیقت کا

فروغِ طالعِ خاشاک - ہے موقوف گلخن پر

اسد - بسمل[4] ہے کس انداز کا! قاتل سے کہتا ہے

کہ مشقِ ناز کر - خونِ دو عالم میری گردن پر

ثانی میں گریبان سے خطاب کیا گیا ہے - گریبان منادیٰ اور سے حرفِ ندا محذوف ہے - مطلب یہ ہے کہ اے گریبان اس چاک کا میری گردن پر حق ہو گیا ہے کہ اس نے مجھے عریان کر دیا ورنہ جنون کی دستگیری بغیر عریانی کے نہیں ہو سکتی - عریانی لازمۂ جنون ہے ۱۲

[1] مصرعہ اول کے آخر میں "ہے" محذوف ہے - نیرنگ = شعبدہ - بال = ساز و - اس شعر کی نثر یوں ہوئی نیرنگ بیتابی شکلِ کاغذ آتش زدہ ہے کہ دل نے ایک ایک بال تپیدن پر ہزار ہزار آئینے باندھے ہیں - شاعر نے شعر میں آئینۂ متحرک کو اس شعلے سے تشبیہ دی ہے جو کاغذ آتش زدہ سے بلند ہو ۱۲ -

[2] متاعِ بردہ = یعنی لوٹی ہوئی پونجی ۱۲

[3] بے سبب رنج = بلا وجہ رنجیدہ ہونے والا - آشنا دشمن = معشوق - شاعر کہتا ہے کہ ہم کو بے سبب رنجیدہ ہونے والے دشمن سے کام پڑا ہے جو شعاعِ مہر کو تار نظر سمجھ کر چشمِ روزن پر بدنگاہی کا الزام رکھتا ہے - بعض دیوانوں میں رنج آرا چھپ گیا ہے وہ غلط ہے ۱۲

[4] اس شعر میں لفظ "کس" استفہامیہ نہیں ہے - بلکہ اظہار تعجب کے لیے استعمال ہوا ہے ۱۲ -

ستم کش مصلحت سے ہوں۔ کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلّف برطرف۔ مل جائے گا۔ تجھ سا رقیب[1] آخر

لازم تھا۔ کہ دیکھو میرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر۔ گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دِن اور

آئے ہو کل۔ اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا۔ کہ ہمیشہ نہیں۔ اچھا۔ کوئی دِن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں۔ اے[2] فلکِ پیر۔ جواں تھا ابھی۔ عارف
کیا تیرا بگڑتا؟ جو نہ مرتا کوئی دِن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

[1] تجھ سا رقیب: تیری مثل وہ حسین جو تجھ پر عاشق ہے ۱۲

[2] عارف تخلص تھا زین العابدین خاں کا جو مرزا غالب کے خسر پورہ تھے جوانی میں اُن کو موت آ گئی۔ یہ غزل اُنھیں کے مرثیے کے طور پہ لکھی گئی ہے۔ اس شعر سے پہلے اور بعد کے سب اشعار میں اُنھیں کو خطاب کیا ہے ۱۲

تم کون سے تھے ایسے کھرے دادِ ستد کے؟
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی۔ نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو۔ کہ کیوں جیتے ہیں غالب؟
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

ردیف (ز)

فارغ مجھے نہ جان۔ کہ مانندِ صبح و مہر[2]
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گُل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

[1] نیّر: مرزا غالب کے ایک شاگرد ضیاء الدین احمد اُن کے مخصوصین میں تھے۔ عارف کو نیّر کے ساتھ مرزا کی خصوصیت ناگوار تھی۔ یہ اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے ۱۲۔

[2] اس شعر میں جیب و کفن کو صبح سے اور داغِ عشق کو آفتاب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں مرنے پر بھی عشق سے خالی نہیں ہوں۔ ۱۲

مے خانۂ جگر میں - یہاں خاک بھی نہیں (١)
خمیازہ کھینچے ہی بت بے داد فن ہنوز

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں - فسونِ نیاز (٢)
دعا قبول ہو یا رب - کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ - بیاباں نوردِ وہمِ وجود (٣)
ہنوز تیرے تصور میں ہی نشیب و فراز

وصال - جلوہ تماشا ہی پر دماغ کہاں (٤)
کہ دیجیے آئینۂ انتظار - کو پرواز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہی آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں - **غالب!** (٥)
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہی - ایک خاک انداز

---

١ اس شعر میں شاعر نے خون کو شراب سے نسبت دی ہی اور معشوق کی نسبت کہا ہی کہ وہ میرے خونِ جگر کو شراب سمجھ کر پیتا ہی - شاعر نے اس شعر میں اپنے معشوق ستم پیشہ کی خونخواری کا نقشہ اس طرح کھینچا ہی کہ اب میرے جگر میں خون کا ایک قطرہ تک باقی نہیں رہا لیکن وہ اس کی تمنا میں اب تک انگڑائیاں لے رہا ہی -

٢ فسونِ نیاز = دعائے نیاز - اس شعر میں شاعر نے کمال حسرت و یاس کا اظہار کیا ہی وہ کہتا ہی کہ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے کی دعا تو قبول نہیں ہوتی اس لیے اب ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی سے دی جا چکی ہو مثلاً عمرِ خضر کی درازی ۱۲-

٣ اس شعر میں شاعر نے وحدت الوجود کے مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہی وہ کہتا ہی کہ تو بیہودگی سے وہمِ وجود کے بیاباں میں بھٹکتا نہ پھر مطلب یہ ہی کہ تو وحدۃ الوجود کا عقیدہ اختیار کر - ہنوز تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں یعنی اب تک تیرا تصور ناتمام اور ناقص ہی ۱۲

٤ وصال جلوہ تماشا = یہ فارسی ترکیب ہی یعنی وصالِ یار جلوۂ حسن کا تماشا دکھانے والا ہی - پرداز یعنی صیقل - شاعر کہتا ہی کہ انتظار کے بعد جلوۂ حسنِ یار کا تماشا ممکن ہی لیکن انتظار کی طاقت کسے ہی ۱۲ -

٥ مے خانۂ جنوں = صحرائے جنوں - کاسۂ گردوں = آسمان - خاک انداز وہ ظرف جس میں بھر کر کوڑا کرکٹ پھینکا جائے ۱۲

وسعتِ[1] سعیِ کرم دیکھ۔ کہ سرتاسرِ خاک
گزرے ہی۔ آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

یک قلم۔ کاغذِ[2] آتش زدہ ہی۔ صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہی تپ گرمیِ رفتار ہنوز

کیوں کر۔ اس[3] بت سے رکھوں جان عزیز؟
کیا نہیں ہی مجھے ایمان عزیز؟

دل سے نکلا[4]۔ پہ نہ نکلا دل سے
ہی ترے تیر کا پیکان عزیز۔

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہی اور جان عزیز

نہ گلِ نغمہ ہوں۔ نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو۔ اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

[1] شاعر نے اس شعر میں کریموں کی شان دکھائی ہی۔ مطلب یہ ہی کہ کریموں کو بخشش کرتے کرتے تنگ نہ آجانا چاہیئے بلکہ ابرِ گہربار کی مثال سے سبق لینا چاہیے کہ وہ باوجود آبلہ پائی کے مینہ برسانے میں سرگرم رہتا ہی۔ قطراتِ باراں کی بنا پر ابر کو آبلہ پا کہا ہی ۱۲۔

[2] کاغذ اور صفحے کی مناسبت سے یک قلم کا لفظ بکسر کے معنی میں اس شعر میں استعمال کیا گیا ہی شاعر کہتا ہی کہ ایسا گرم رفتار ہوں کہ میرے نقشِ قدم میں اب تک وہ گرمی باقی ہی جس سے میدانِ دشت کاغذِ آتش زدہ بنا ہوا ہی ۱۲

[3] مطلب یہ ہی کہ مذہبِ عشق میں محبوب سے جان عزیز رکھنا۔ یعنی اس پر جان قربان نہ کرنا کفر ہی ۱۲

[4] نہ نکلا دل سے: فراموش نہ ہوا ۱۲

لافِ تمکیں۔ فریبِ سادہ دلی[۱]
ہم ہیں۔ اور رازہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے[۲]
ناز کھینچوں۔ بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں[۳]
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا جلوہ۔ یک قلم انگیز[۴]
اے ترا ظلم۔ سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر۔ مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا۔ تو کچھ غضب نہ ہوا[۵]
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں۔ تمام ہوا
اے دریغا۔ وہ رندِ شاہد باز

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ عشق میں ہماری یہ شیخی کہ ہم بہت بڑے ثابت قدم ہیں۔ ہماری سادہ دلی کے سبب سے ہے کیونکہ ہمارے دل میں تو ایسے سینہ گداز راز بھرے ہوئے ہیں جن کے ہوتے ہوئے تمکین یعنی ثابت قدمی اور وقار کا باقی رہنا مشکل ہے ۱۲

[۲] اس شعر میں لفظ "سے" بمعنی "سے لیے" آیا ہے ۱۲

[۳] یعنی سارا خون پلکوں سے ٹپک گیا ۱۲۔

[۴] مصرعہ اولیٰ میں "اے" کے بعد "نازنین" اور مصرعہ ثانی میں "اے" کا منادیٰ "ظالم" محذوف ہے ۱۲

[۵] اس شعر کے مصرعہ اول میں "کچھ غضب نہ ہوا" کے ٹکڑے نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے جو نہایت کثیر المعنی ہے۔ اس جملہ کی جگہ کوئی دوسرا ٹکڑا یہاں پر ختم کر دیا جائے مثلاً "مہربانی کی" تو وہ بات پیدا نہیں ہوتی ۱۲۔

ردیف (س)

مژدہ۔ اے ذوقِ اسیری۔ کہ نظر آتا ہے
دام خالی۔ قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار[لہ]۔ تسلّی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی۔ بُنِ ہر خار کے پاس

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
خوب وقت آئے تم۔ اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا۔ جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غم خوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے۔ لیکن اے دل!
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو۔ چمن بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود۔ پہنچے ہے گُل۔ گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر۔ غالبِ وحشی۔ ہے ہے!
بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

لہ تشنۂ آزار: خواہش مند آزار۔ شاعر نے تسلّی نہ ہوا، بمعنی تشفّی نہ ہوا۔ یعنی تسلّی پانے والا نہ ہوا باندھا ہے

ردیف (ش)

نہ لیوے[1] گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں۔ روئے نگار۔ آتش

فروغِ[2] حسن سے ہوتی ہی حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے۔ شمع کے پاسے۔ نکالے گر نہ خارِ آتش

ردیف (ع)

جادۂ[3] رہ۔ خور کو وقتِ شام ہی تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہی ماہِ نو سے آغوشِ وداع

[1] اس شعر میں جوہرِ آئینہ کو شاعر نے خسِ جوہر کہا ہی مطلب یہ ہی کہ جوہرِ آئینہ کو معشوق کے سبزۂ خط سے طراوت پہنچ جاتی ہی ورنہ اس کے آتشیں رخ کے عکس سے خانۂ آئینہ میں آگ لگ جائے ۱۲۔

[2] موم بتی میں جو ڈورا ہوتا ہی اسے خارِ شمع کہا گیا ہی۔ مطلب یہ ہی کہ جب موم بتی روشن ہوتی ہی تو ڈورا جل پلے شمع سے نکل جاتا ہی یعنی آتش سے شمع کی مشکل حل ہوتی ہی ۱۲۔

[3] یہ صرف ایک شعر ہی۔ پوری غزل نہیں ہی غزل سے اس کا تعلق بھی نہیں ہی۔ شاید کسی قصیدہ کا مطلع ہی۔ تارِ شعاع شاعر نے اُس خط کو کہا ہی جو غروبِ آفتاب کے بعد (اور طلوع سے کچھ قبل) ایک خطِ ابیض آسمان پر دکھائی دیتا ہی (اہلِ رصد کی زبان میں اس کو فجر الشمس کہتے ہیں) مطلب یہ ہی کہ شام کے وقت آفتاب سفر کرنے کو آمادہ ہی اور آسمان ماہِ نو کو آغوشِ وداع کی صورت میں ظاہر کر کے رخصتی معانقہ کرنے کے لیے تیار ہی ۱۲

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع[۱]
ہوئی ہے آتشِ گُل آبِ زندگانیِ شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

غم اُس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ[۲]
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

ترے[۳] خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

نشاطِ[۴] داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گُلِ خزانیِ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع؟

---

۱ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے رُخ سے شمع کو سوزِ جاودانی ہے۔ آتشِ گُل کو جو کہ چہرۂ معشوق میں ہے شمع کے لیے آبِ حیات قرار دیا ہے کیونکہ شمع اسی وقت تک زندہ سمجھی جاتی ہے جب تک کہ وہ روشن رہے۔ بجھی ہوئی شمع کو شاعر شمعِ کشتہ کہتے ہیں ۱۲

۲ شعلہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے شعلہ تیرے لرزنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرتِ پروانہ کے غم سے شمع ناتواں ہو گئی ہے۔ ۱۲

۳ اہتزاز یعنی جنبشِ سرور۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہوا کی جلوہ ریزی سے شمع کو حرکت ہوتی ہے اسی طرح تیرے خیال سے روح جنبشِ سرور میں آجاتی ہے ۱۲

۴ شہید۔ عاشق۔ گُلِ خزانی یعنی گُلِ خزاں زدہ۔ مطلب یہ ہے کہ غمِ عشق کا داغ جو خوشی سے باغ باغ ہو رہا ہے اس کی کیفیتِ بہار کچھ نہ پوچھ۔ اس کی شگفتگی شمع کے خزاں زدہ گُل کی عاشق ہے یعنی فنا ہونے والی ہے ۱۲۔

ردیف (ف)

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبور یاں تلک ہوئے۔ اے اختیار حیف

جلتا ہے دل۔ کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے؟
اے ناتمامیِ نفسِ[1] شعلہ بار حیف

ردیف (ک)

زخم پر چھڑکیں کہاں۔ طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا۔ اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ[2] راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے۔ تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

شورِ[3] جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا؟ کہ آج
گردِ ساحل ہے۔ بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

[1] نفس = بہ معنی آہ ۱۲

[2] معشوق کے رستہ کی گرد ہمارے زخمِ دل کے لیے شایانِ ناز ہے ورنہ دنیا میں نمک تو بہت پیدا ہوتا ہے مطلب یہ کہ نمک چاہے جس قدر زخمِ دل پر کیوں نہ چھڑکا جائے لیکن اس میں وہ مزہ نہیں ملتا جو زخمِ دل میں "گردِ یار" کے بھر جانے سے ملتا ہے ۱۲

[3] دریا کے کنارے کس معشوق کا گھوڑا آج گرمِ جولاں تھا کہ ساحل کی گرد موجِ دریا کے حق میں نمک بن گئی مطلب یہ ہے کہ توسنِ یار کی گرم جولانی کے مقابلے میں دریا کے جوش و خروش کی کچھ حقیقت نہیں ۱۲

داد[۱] دیتا ہی مرے زخمِ جگر کی - واہ وا
یاد کرتا ہی مجھے - دیکھے ہی وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہی
دل طلب کرتا ہی زخم - اور مانگیں ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا - پے توفیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہی - سرتا پا نمک

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن؟ کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا - تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہی تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہی - حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے - قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل[۲] کا کیا رنگ کروں - خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم - تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ[۳] خور سے ہی شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک[۴] نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہی - یک رقصِ شرر ہونے تک

---

۱ زخمِ جگر کی داد دینا: - زخمِ جگر پر نمک چھڑکنا ۱۲
۲ دل کا کیا رنگ کروں: دل کے بننے کے لیے کیا تدبیر کروں ۱۲
۳ معشوق کی نظرِ عتاب کو آفتاب کے عکس سے تشبیہ دی ہی ۱۲
۴ اس شعر میں انسان کو غافل کہہ کر مخاطب کیا ہی - "اے" محذوف ہی ۱۲

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو؟ جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہی سحر ہونے تک

ردیف (گ)

گر تجھ کو ہی یقینِ اجابت دعا نہ مانگ[1]
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا۔ نہ مانگ

آتا ہی داغِ حسرتِ دل کا شمار۔ یاد
مجھ سے۔ مرے گنہ کا حساب۔ اے خدا نہ مانگ

ردیف (ل)

ہی کس[2] قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل!
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

آزادیِ نسیم مبارک۔ کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہ‘ دامِ ہوائے[3] گُل

لہ بغیر کے معنی یہاں سوا کے ہیں مطلب یہ ہو کہ دل بے مدعا کے سوا کسی اور چیز کے تو حاصل ہونے کی دعا نہ مانگ یعنی جب دل بے مدعا ملنے کی دعا قبول ہو جائے گی، اور وہ تجھے مل جائے گا تو دعا مانگنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی ۱۲

ٹہ بلبل جو وفائے گُل کے فریب کا کشتہ ہی اُس کی اس حماقت و سادگی پر خود پھول خندہ زن ہیں کہ اُس نے خوب دھوکا کھایا! ۱۲ ٹہ ہوائے گل:۔ شوقِ گُل۔ مطلب یہ ہی کہ غنچۂ گل کے دام میں جو بوئے گُل مقید

۱ جو تھا۔ سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے۔ نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

۲ خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا۔ کہ جو
رکھتا ہو۔ مثلِ سایۂ گل۔ سر بہ پائے گل

ایجاد کرتی ہی اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہی۔ نفسِ عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے! دبہار سے
مینائے بے شراب۔ و۔ دلِ بے ہوائے گل

۳ سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہی مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوہ کا ہی یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہی گل۔ در قفائے گل

۴ غالب۔ مجھے ہی اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہی گلِ جیبِ قبائے گل

یعنی گل کے کھل جانے سے شوقِ گل کا دام شکستہ ہوگیا یعنی بوئے گل آزاد ہوگئی ۱۲

۱ مطلب یہ ہی کہ گل کا رنگ درحقیقت نوائے خوش اور نالۂ خوں چکاں ہی ہر شخص اس پر موجِ رنگ کا دھوکا کھا کر فریفتہ ہوگیا ۱۲

۲ سایۂ گل سے عاشق سیہ مست اور گل سے معشوق مراد ہی۔ وجہ تشبیہ ظاہر ہی ۱۲

۳ سطوت: رعب۔ مطلب یہ ہی کہ تیرے حسنِ غیرت مند کے رعب سے گل کی ادا کا رنگ میری نگاہ میں خون نظر آتا ہی یعنی بھلا نہیں معلوم ہوتا ۱۲

۴ "اس سے ہم آغوشی آرزو ہی" غالب نے اپنے مذاقِ طبع کے مطابق فارسی محاورہ "ازو آرزوے ہم آغوشی دارم" کا ترجمہ کیا ہی۔ یعنی اس سے ہم آغوشی کی آرزو ہی جس کے خیال کو گل نے اپنا زینتِ گریبان بنایا ہی ۱۲۔

ردیف (م)

غم نہیں ہوتا ہی آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

[۱] محفلیں برہم کرے ہی۔ گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

باوجودِ یک جہاں۔ ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

[۲] ضعف سے ہی۔ نے قناعت سے۔ یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو۔ زنداں خانہ ہم

---

۱ خیال کا محفلوں کو برہم کرنا یعنی جو محفلیں برہم ہو گئی ہیں اُن کی برہمی کی یاد تازہ کرنا۔ ہم ورق گردانیِ نیرنگ بت خانہ ہیں یعنی ورق گرداندہ نیرنگ بُت خانہ ہیں ۱۲۔

۲ ہم نے جستجو ترک کر دی ہی۔ یہ قناعت کی بنا پر نہیں ہی بلکہ ہم میں جستجو کی طاقت ہی نہیں ہی اس لیے ہم تکیہ گاہ ہمت مرداں کے لیے وبال بن گئے ہیں یعنی مردوں کا یہ کام ہی کہ ہمت کو تکیہ گاہ بنائیں لیکن یہاں معاملہ بالعکس ہی ۱۲۔

؎ بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر	متاعِ خانۂ زنجیر جُز صدا معلوم

مُجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہائے زلف کمیں میں ہیں۔ اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوی وارستگی کی شرم

ردیف (ن)

لوں۔ وام بختِ خفتہ سے۔ یک خوابِ خوش ولے
غالب۔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟	وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے؟	ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟
دل تو دل۔ وہ دماغ بھی نہ رہا	شورِ سودائے خط و خال کہاں؟
تھی وہ اک شخص کے تصور سے	اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں؟

ؔ اس شعر میں اگر "کر" کی جگہ "کن" رکھ دیا جائے تو بالکل فارسی شعر ہو جائے گا۔ ترجمہ یہ ہو: نالے کے
حاصلِ دل بستگی اپنے قابو میں لا۔ ورنہ خانۂ زنجیر میں بجز شور کے اور کیا رکھا ہے۔ مطلب یہ ہو کہ وہ نالہ کرنا

ایسا آساں نہیں - لہو رونا
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں

دل میں طاقت - جگر میں حال - کہاں؟
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں؟
میں کہاں؟ اور یہ وبال کہاں؟

مضمحل ہو گئے قویٰ **غالب**
وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر - دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ - انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے - ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟

ہے[1] پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو - اہلِ نظر - قبلہ نما کہتے ہیں

چاہیئے جو بُرا اثر ہو۔ ۱۲

[1] شاعر نے اس شعر میں اُن لوگوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان

پائے افگار - پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے

خارِ رہ کو ترے - ہم مہرگیا[1] کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے - اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا؟

آگ مطلوب ہے ہم کو - جو ہوا کہتے ہیں

دیکھیئے - لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ!

اُس کی ہر بات پہ - ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ[2] - اب مرثیہ کہویں شاید

مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

آبِ رو کیا خاک - اُس گُل کی - کہ گلشن میں نہیں

ہے گریباں ننگِ پیراہن - جو دامن میں نہیں

بھی کعبہ کو پوجتے ہیں شاعر نے بتایا ہے کہ ہمارا مسجودِ مطلق ادراک کی سرحد سے بھی اُدھر ہے - یعنی اصلاً کعبہ کو نہ صرف قوتِ سجدہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے - بلکہ قوتِ باصرہ بھی اس کا احساس کرتی ہے - کیونکہ وہ پتھر وغیرہ کی ایک تعمیر ہے - ہم سجدہ نہیں کرتے بلکہ ہم اپنے مسجودِ حقیقی یعنی خدائے وحدہٗ لاشریک کو سجدہ کرتے ہیں لیکن چونکہ سجدے کے لیے جہت ضروری ہے اس سبب سے جہتِ کعبہ کو معین کر لیا ہے - اسی اصول پر فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ اگر سفر میں کسی کو کعبہ کی سمت معلوم نہ ہو تو وہ شخص جس سمت کو منہ کر کے نماز پڑھے گا اُس کی نماز ہو جائیگی مطلب یہ ہے کہ سمت در اصل قبلہ نہیں بلکہ قبلہ نما ہے ۱۲

[1] مہرگیا ایک قسم کی بوٹی ہے جس کی جڑ بشکل انسان ہوتی ہے مشہور ہے کہ لوگ اس کو بطورِ عمل تسخیر اپنے پاس رکھتے ہیں جس کے پاس یہ بوٹی ہوتی ہے اس پر لوگ مہربان ہوتے ہیں ۱۲ -

[2] غلام علی خاں وحشت تلمیذ مومن اور نواب مصطفٰے خاں شیفتہ غالب کے دوستوں میں تھے - نواب مصطفٰے

ضعف سے اے گریہ۔ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا۔ جو خوں۔ کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم۔ اندھیر ہی
پنبہ۔ نورِ صبح سے کم۔ جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہی۔ عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہی۔ گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہی طعن
غیر سمجھا ہی کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

بس کہ۔ ہیں ہم اِک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گُل کے سوا۔ گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اِک ہیولیٰ[1] ہی نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

خاں شیفتہ صاحب تذکرہ گلشنِ بیخار مشہور شعرا میں گزرے ہیں شیفتہ کی کلیات مع نسخہ عرشی مطبع نظامی بدایوں میں ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی

[1] ہیولیٰ: اس مادے کو کہتے ہیں جو مختلف صورتوں میں تبدیل ہونے کی قابلیت رکھتا ہو۔ شعر کا مطلب یہ ہو کہ میرے لہو کا ہر قطرہ جدید ناسور کی صورت پیدا کرنے والا ہی۔ یعنی جس جگہ بدن میں لہو کی بوند ہو اسی جگہ نیا ناسور پیدا ہو جائے گا گویا میرے خون کے ہر قطرے میں ذوقِ درد موجود ہی اور اسی وجہ سے وہ ایک نیا ناسور بن جانا چاہتا ہی ۱۲

لے گئی۔ ساقی کی نخوت[1]۔ قلزم آشامی مری
موجِ مے کی۔ آج رگ۔ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں۔ کیا ناتوانی کی نمود؟
قد کے۔ جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ؟ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں۔ وہ مشتِ خس۔ کہ گلخن میں نہیں

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
گر اک ادا ہو۔ تو اُسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو۔ اور ایک وہ نہ شنیدن۔ کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہَے ہَے۔ خدا نہ کردہ۔ تجھے بے وفا کہوں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے؟
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر۔ ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

---

[1] چونکہ پہلے مصرعے میں نخوت کا ذکر ہے اس لیے اُس کی رعایت سے گردنِ مینا میں موجِ مے کی رگ کہا گیا۔ کیونکہ غرور کو رگِ گردن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری بلانوشی نے ساقی کا غرور مٹا دیا اور مینا کی گردن میں موجِ مے کی رگ نہ رہی یعنی سب شیشے خالی ہو گئے ۱۲۔

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس مُنہ سے شکر کیجیئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجیئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ق

ہر چند - جاں گدازیِ قہر و عتاب ہی
ہر چند - پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں - مطربِ ترانۂ ہَل مِن مزید ہی
لب - پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ - اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو - مژہ گر - خوں چکاں نہیں

ہی ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہی عارِ دل نَفَس - اگر آذر فشاں[2] نہیں

نقصاں نہیں - جنوں میں - بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں - گراں نہیں

کہتے ہو "کیا لکھا ہی تری سرنوشت میں"؟
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

[1] یہ شعر اپنے بعد والے شعر کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے کیوں کہ یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں: مطلب یہ کہ ہر چند معشوق کا قہر جاں گداز ہی اور ہمارے تاب و طاقت نے جواب دے دیا ہی یعنی ہم اس کو برداشت نہیں کر سکتے - لیکن پھر بھی ہم اس کے قہر سے الاماں نہیں پکارتے بلکہ جانِ زار کا یہی سوال ہی کہ اور کوئی ظلم اگر باقی رہ گیا تو میں اس کے لیے تیار ہوں ۱۲

[2] آذر فشاں: آتش فشاں ۱۲

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہی بہائے بوسہ۔ ولے کیوں کہے ابھی؟
غالب کو جانتا ہی کہ وہ نیم جاں نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہی مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق[1] اُس دشت میں دوڑائے ہی مجھ کو۔ کہ جہاں
جادہ۔ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر۔ نہیں

حسرتِ لذّتِ[2] آزار۔ رہی جاتی ہی
جادۂ راہِ وفا۔ جز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدیِ[3] جاوید۔ گوارا رہیو
خوش ہوں۔ گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

[1] شوق مجھے اُس جنگل میں لیے جاتا ہی جہاں حیرت کے سوا کوئی راہ نہیں یعنی وادی عرفان میں پہونچ کر ہر شخص محوِ حیرت ہوجاتا ہی ۱۲

[2] شاعر حسرت کے ساتھ کہتا ہی کہ راہِ وفا کا جادہ تلوار کی باڑھ کے سوا کوئی اور نہیں ہی یعنی باوفا کے بےقتل ہوجانے کے سوا دوسری راہ منزل مقصود پہ پہنچنے کی نہیں ہی۔ اور جب عاشق قتل ہوجاتا ہی تو لذت آزار کی حسرت رہ جاتی ہی ۱۲

[3] زبون بالفتح زا بمعنی عاجز و ضعیف ترکی زبان میں زشت و بد کو کہتے ہیں۔ اس شعر میں انتہا درجہ کی غیرت کا اظہار کیا گیا ہی۔ شاعر کہتا ہی کہ مجھے ہمیشہ کی یاس اور ناامیدی ہی روزی رہے۔ مجھ کو یہ گوارا نہیں کہ میرا نالہ تاثیر کے سامنے عاجز ہوجائے۔ فریاد کو اثر نصیب ہونا شاعر اپنی ذلت سمجھتا ہی ۱۲

سر کھجاتا ہے۔ جہاں[1] زخمِ سر اچھا ہو جائے
جب[2] کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے

لذتِ سنگ۔ بہ اندازۂ تقریر نہیں
کوئی تقصیر۔ بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالب۔ اپنا یہ عقیدہ ہے۔ بقولِ ناسخ
"آپ بے بہرہ ہے۔ جو معتقدِ میر نہیں"

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع[3] سویدائے دلِ چشم میں آہیں

یہ شکالِ دیدۂ عاشق ہے۔ دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گل۔ سو جا سے دیوارِ چمن

الفتِ گل سے۔ غلط ہے دعوئ وارستگی
سرو ہے با وصفِ آزادی۔ گرفتارِ چمن

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت[4] دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

[1] جہاں = جس وقت۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت زخمِ سر اچھا ہو جاتا ہے سر کھجانے لگتا ہے۔ یعنی یہ خواہش ہوتی ہے کہ پھر پتھر لگیں۔ پتھروں کی چوٹ میں جو لطف آتا ہے وہ بیان سے باہر ہے ۱۲

[2] جب کرمِ یار گستاخی کی اجازت دے تو اُس وقت جھجکنا ہی بہت بڑا قصور ہے ۱۲

[3] جس طرح آنکھ میں تل ہوتا ہے۔ اُسی طرح دل میں ایک نقطہ ہوتا ہے اُس کو سودا کہتے ہیں۔ دلِ چشم یعنی وسطِ چشم ۱۲

[4] سلطنت سے جامِ شراب کی سلطنت مراد ہے جو جمشید سے رندوں تک دست بدست پہنچی ہے۔ وہ جمشید کی انگوٹھی نہیں ہے جو اُس کی ذات پر ختم ہو جائے ۱۲

ہے[۱] تجلی تری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ[۲] رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ — ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

جہاں[۳] تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دل آشفتگاں۔ خالِ کنجِ دہن کے — سویدا میں۔ سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا[۴] کر۔ اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سراغِ[۵] تفِ نالہ لے۔ داغِ دل سے — کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

---

۱ شاعر خداوند عالم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تیری ذات کی جلوہ گری باعثِ وجودِ عالم ہے جیسے طلوعِ خورشید ذروں کے لیے باعثِ ظہور ہوا ۱۲۔

۲ اس شعر میں "مجھ کو" محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حصولِ طرب کے بعد اس کا زوال ایسا جانکاہ ہے کہ اس سے محرومیِ جاوید بہتر ہے ۱۲

۳ خیاباں خیاباں:۔ بہ معنی کثرت ۱۲

۴ تماشا کر:۔ تماشہ کُن کا اردو ترجمہ ہے بہ معنی دیکھ۔ ایک قدیم نسخے میں "تماشا کہ" بھی لکھا ہے۔ اس سے بھی مطلب وہی رہتا ہے ۱۲

۵ تفِ نالہ:۔ نالے کی گرمی۔ شب رو:۔ مسافرِ شب۔ چونکہ نالہ کشی رات کو ہوا کرتی ہے اس لیے نالے کو مسافرِ شب قرار دیا ہے شاعر کہتا ہے کہ جس طرح صبح کو نقش قدم دیکھ کر مسافر کے آنے جانے کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح تو داغِ دل سے نالۂ شب کی گرمی کا سراغ لگا لے ۱۲۔

بناکر فقیروں کا ہم بھیس "غالب"
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ملتی ہی خوے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں۔ کیا بتاؤں۔ جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا۔ پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے۔ آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے۔ خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو۔ فریب اُس پہ کیا چلے؟[1]
کیوں بدگماں ہوں۔ دوست سے دشمن کے باب میں

[1] مطلب یہ ہے کہ معشوق منکرِ وفا ہے یعنی اُس کو کسی کی وفا کا یقین نہیں ہے اس سے تیری بدگمانی فضول ہے کہ کہیں اُس پر رقیب کے اظہارِ وفاداری کا فریب نہ چل گیا ہو۔ مصرعہ ثانی میں دوست سے معشوق کی طرف اور دشمن سے رقیب کی طرف اشارہ ہے۔

❀❀❀

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے[1]
ڈالا ہی تم کو وہم نے کس پیچ وتاب میں؟

میں اور حظِ وصل - خدا ساز بات ہی
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہی تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہی اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ ! دل میں خس کے برابر جگہہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر! مدعا طلبی میں نہ کام آئے!
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب چھٹی شراب - پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

---

[1] معشوق کے وہم سے یہ مراد ہی کہ وصل میں عاشق کی بے چینی سے معشوق کو یہ خیال پیدا ہوا ہی کہ اس کو کسی دوسرے حسین کے خیال نے اس وقت مضطرب کر دیا ہی پہلے مصرعہ میں اس خیال کی تردید کی گئی ہی ۱۲-

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں[1]

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں[2]

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں[3]

---

[1] اس شعر میں استفہام سے شاعر کا یہ مطلب نہیں کہ اس سوال کا جواب دیا جائے بلکہ سامع کی تنبیہ مقصود ہے اشارہ ہے حضرت آدم کے اس مشہور قصے کی طرف کہ عزازیل فرشتے کو حکم ہوا تھا کہ وہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرے لیکن تعمیل حکم نہ کرنے کے سبب وہ راندۂ درگاہ ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ کل تو حضرت آدم کی درگاہِ باری میں یہ عزت و توقیر تھی اور آج انھیں کی اولاد دنیا میں آکر اپنے ہی ہاتھ سے ذلیل ہو گئی ۱۲

[2] سماع: بالفتح: بمعنی سننا اور اصطلاحِ صوفیائے کرام میں معرفتِ الٰہی کے اشعار سننے کو جو خوش آوازی کے ساتھ گائے جائیں کہتے ہیں۔ اس شعر میں استفہام سے صرف استعجاب مقصود ہے۔ وہ صدا سے اشارہ شاہدِ حق کی صدا کی طرف۔ شاعر کہتا ہے کہ شاہدِ حق کی صدا تو جاں بخش ہے۔ پھر اس کا یہ الٹا اثر کیوں ہے کہ اس کو سن کر سامعین کی جان فنا ہو جاتی ہے۔ اہلِ ذوق کو جو لطف سماع سے حاصل ہوتا ہے اس شعر میں اس کا اظہار کیا گیا ہے ۱۲

[3] شاعر کہتا ہے کہ جس قدر ماسوا کے وہم سے میں پیچ و تاب میں رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت سے بُعد ہے۔ غیر سے مراد ماسوائے اللہ ہے جو صوفیہ کے نزدیک معدوم ہے ۱۲ (یادگارِ غالب)

اصلِ[۱] شہود و شاہد و مشہود ایک ہی
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہی کس حساب میں

ہی مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہی قطرہ و موج و حباب میں

شرم[۲] اک ادائے ناز ہی اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ[۳] جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہی آئینہ دائم نقاب میں

ہی غیب[۴] غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

---

۱ مشاہدہ شاہد و مشہود کے وجود کو علیحدہ علیحدہ چاہتا ہی اور یہاں جب تمام عالم بوجود واحد موجود ہی تو شاہد و مشہود ایک ہی ہوئے یعنی جب شاہد و مشہود میں مغائرت نہیں تو پھر مشاہدہ کس طرح ہو سکتا ہی ۱۲

۲ شرم اُن کی ایک ادا ہی ورنہ کچھ نہیں تو اپنے نفس ہی سے شرم کرتے ہیں یعنی با وجود پردے میں رہنے کے وہ اپنے سے تئیں شرماتے۔ حالانکہ شرم کے یہ معنی ہیں کہ خود اپنی ذات سے بھی حیا آئے ۱۲۔

۳ شاعر کہتا ہی کہ باوجود پردے میں رہنے کے اس کا معشوق مصروفِ آرائشِ جمال ہی اور یہ فضول ہی کیونکہ آرائش کا مقصد تو یہ ہی کہ عشاق اس کو دیکھیں ۱۲۔

۴ جس طرح اس غزل کے اکثر اشعار معرفت میں ڈوبے ہوئے ہیں اسی طرح اس شعر میں بھی تصوف کا ایک اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہی۔ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں اس شعر کا جو حل لکھا ہی وہ یہ ہی: سالک کو تمام موجوداتِ عالم جو نظر آتا ہی اس کو شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیتِ ذات ہی جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الورا ہی شاعر کہتا ہی کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہی اور اُس کو غلطی سے شہود سمجھتے ہیں۔ ہماری ایسی مثال ہی جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں پس گو وہ اپنے کو بیدار سمجھتا ہی مگر فی الحقیقت وہ ہنوز خواب میں ہی ۱۲

غالب۔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں۔ بندگیِ بوتراب میں

حیراں ہوں۔ دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔
مقدور ہو۔ تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ ترے رہ گزر کو میں

ہے کیا؟ جو کَس کے باندھیئے۔ میری بَلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں؟ تمہاری کمر کو میں

لوؔ وہ بھی کہتے ہیں "کہ یہ بے ننگ و نام ہے"
یہ جانتا اگر۔ تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

لہ مطلب یہ ہے کہ معشوق جس کی خاطر میں بے سر و سامان ہوا مجھے طعنہ دیتا ہے اگر میں ایسا جانتا تو میں اپنے کو تباہ و برباد نہ کرتا ۱۲۔

ٹہ اس شعر میں ایک پریشان حال مسافر کی جو راستہ بھولا ہو۔ ہو بہو تصویر کھینچ گئی ہے۔ گھر چھوڑے ہوئے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری۔ وحشتِ غربت میں بادیہ پیمائی کی منزلیں کٹھن معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے جو تیز رو شخص ملتا ہے اُس کے

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بے داد گر کو میں؟

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہُنر کو میں

غالب۔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علیؔ بہادرِ عالی گُہر کو میں

ذکر میرا۔ بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے۔ خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ[1] مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

ساتھ ہو لیتا ہے تاکہ منزلِ مقصود پر جلد پہنچے اور مسافرت کی تکلیف کا خاتمہ ہو۔ مصرعۂ ثانی میں "ابھی" کے لفظ سے شاعر کو یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ابھی اس دشت میں قدم رکھے ہوئے تھوڑی ہی مدت گزری ہے اور اس لیے اسے اپنے رہبر کے انتخاب کی صحیح قابلیت حاصل نہیں ہوئی۔ جسے تیز رو دیکھتا ہے اسی کے پیچھے ہو لیتا ہے

[1] یہ شعر ان نبض شعروں میں سے ہے جن کو لوگ بے معنی کہتے ہیں۔ ایک شارح نے اس شعر کو غالب کی طرف منسوب کرنے

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہی دریا۔ لیکن
ہم کو تقلیدِ تُنک ظرفیِ منصور نہیں

حسرت۔ اے ذوقِ خرابی۔ کہ وہ طاقت نہ ہی
عشقِ پُرعربدہ[1] کی گوں تنِ رنجور نہیں

ظلم کر ظلم۔ اگر لطف دریغ آتا ہو[2]
تو تغافل میں۔ کسی رنگ سے معذور نہیں

میں جو کہتا ہوں۔ کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں "کہ ہم حور نہیں"

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں۔ ظہوری کے مقابل میں خفائیِ غالب
میرے دعوے پہ یہ حجّت ہی کہ مشہور نہیں

میں بھی شک کیا ہی. وہ اس کو الحاقی سمجھتے ہیں۔ الفاظ سے جو کچھ مطلب لیا جا سکتا ہی وہ صرف اس قدر ہی کہ شاعر نے اس شعر میں دنیا کے موہوم ہونے کو بہ غلو بیان کیا ہی۔ مصرعہ ثانی میں لفظ منظور کے معنی مرئی کے لیے ہیں "منظور ہونا" کا اسم مفعول ہی)

[1] عربدہ: بدخوئی و جنگ جوئی۔ شاعر اس شعر میں اپنے گزشتہ دم خم کو بہ حسرت یاد کرتا ہو اور کہتا ہو کہ اب ہمارا تنِ رنجور عشق جیسے جنگ جو دشمن کے مقابلے کی گوں نہ رہا۔ یعنی قابل نہ رہا ۱۲

[2] شاعر کہتا ہو کہ اگر تو ہم سے تغافل ہی ضروری سمجھتا ہو تو ظلم ہی کر کیونکہ وہ بھی تغافل کی ایک ادا ہی اور تو تغافل کی ہر ادا برتنے پر قادر ہی ۱۲۔

نالہ - جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا - شکوۂ بے داد نہیں

عشق[1] و - مزدوریِ عشرت گہِ خسرو - کیا خوب
ہم کو تسلیم - نکو نامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں - پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ[2] بینش کو ہے طوفانِ حوادث - مکتب
لطمۂ موج - کم از سیلیِ اُستاد نہیں

وائے[3] محرومیِ تسلیم - و - بدا - حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکینِ گل و لالہ - پریشاں کیوں ہے؟
گر - چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں؟

---

[1] شاعر نے فرہاد پر جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے شیریں کے وصل کی خاطر پہاڑ سے جوئے شیر نکالی اور پھر اپنا سر پھوڑ کر مر گیا اور شیریں کا وصل خسرو اُس کے رقیب کو نصیب ہوا اس شعر میں طعن کی ہے وہ کہتا ہے کہ اس طریقے سے جان دینے میں فرہاد کی نیک نامی کی کیا بات ہے کہ اس نے رقیب کے لیے عشرت کدہ بنایا گویا اس نے عشرت کدہ تعمیر کرنے میں مزدور کی خدمت ادا کی ۱۲۔

[2] لطمہ موج: موج کا تھپیڑ - مطلب یہ ہے کہ اہلِ بینش کو دنیا کے حوادث کا طوفان تجربہ کار بناتا ہے یعنی دنیا میں جتنے حادثے انسان پر پڑتے ہیں اتنی ہی اس کی آنکھیں کھلتی ہیں ۱۲

[3] بدا - بد میں حرف الف ندبہ کا زائد کیا گیا ہے جیسے وا در یغا - شاعر اس شعر میں تسلیم کی محرومی اور وفا کی بدحالی پر افسوس کرتا ہوا کہتا ہے کہ ہم جو تسلیم و رضا اور آئینِ وفا کے خوگر ہیں کے سبب نالہ و فریاد نہیں کرتے تو

سبزۂ گل کے تلے بند کرے ہے ۔ گلچیں

مژدہ اے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں

نفی سے کرتی ہے ۔ اثبات ۔ تراوش گویا!

دی ہے ۔ جائے دہن ۔ اُس کو دمِ ایجاد "نہیں"

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت

یہی نقشہ ہے ۔ ولے ۔ اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو ۔ غربت کی شکایت غالبؔ!

تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے ۔ یہ خوش رہا

یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

تیرا پتا نہ پائیں ۔ تو ناچار ۔ کیا کریں؟

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ ۔ اہلِ بزم

ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں؟

عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں	ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر

معشوق اس کو ہماری وفاداری اور تسلیم پر محمول کرنے کے بجائے یہ سمجھتا ہے کہ ہم میں طاقتِ فریاد ہی نہیں ۔

قیامت ہی۔ کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یُوں بھی ہوتا ہی زمانے میں"
دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہی مجھے **غالب**
نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

دل[1] لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بےکسی کی ہم نے پائی داد یاں
ہیں[2] زوال آمادہ۔ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہی چراغِ رہ گزارِ باد۔ یاں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو۔ کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئے گھر میں ہمارے! خدا کی قدرت ہی!
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں۔ اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

[1] لگ گیا:۔ مرض لگ گیا ۱۲
[2] زوال آمادہ:۔ آمادۂ زوال ۱۲

تیرے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نہیں[1]۔ کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے۔ روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ "شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے"
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں۔ تو کہتے ہیں
کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ۔ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم۔ ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو۔ خدا نے وہ دل۔ کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو۔ اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا[2] باندھتے ہیں

[1] اس شعر کی ترکیب لفظی نہایت پر لطف ہے شاعر کہتا ہے کہ یہ واقعہ نہیں کہ مجھے قیامت کا یقین نہیں ہے قیامت برحق ہے لیکن ساتھ ہی اس کے یہ اعتقاد ضرور ہے کہ اس کے شدائد شبِ فراق کی سختیوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ ۱۲

[2] ہوا باندھنا۔ رعب بٹھانا ۱۲

تیری فرصت کے مقابل اے عمر!
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی[1] معلوم
اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوباں۔ **غالب**
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد[2]
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں؟
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

[1] عاشق اپنی مصیبت سے تنگ آکر قیدِ حیات سے رہا ہونے کے لیے آہ و زاری کرتا ہے شاعر کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کوشش میں اس کی آنکھوں سے جو آنسو نکلتا ہے خود اسی کا سر پیر نہیں قطرۂ اشک کی شکل مدور ہوتی ہے اور دائرہ میں بالا و زیر نہیں ہوتا۔ پس اشک کا سروپا کہاں۔ اس لیے اس کی قیدِ ہستی سے رہائی پانے کے معنی بے سروپا ہیں اور اس میں کامیابی معلوم ۱۲

[2] بجانِ اسد = اسد کی جان کی قسم شاعر نے اپنی جان کی قسم کھا کر کہا ہے کہ زمانے کے ہاتھ سے ہمیں جس قدر آزار پہنچا ہے بہت کم ہے ۱۲

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں - پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے - سزا میں - عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں - کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب - وظیفہ خوار ہو - دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

سب کہاں - کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں!

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش[1] گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں؟

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں[2] ہو گئیں

سب رقیبوں[3] سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

---

[1] بنات النعش: آسمان پر شمال کی طرف سات ستارے ہیں چار ستارے ان میں سے جنازہ ہیں اور تین جنازے کے اٹھانے والے بنات کے لفظ کا یہ مفہوم غلط ہے کہ عرب اُن ستاروں کو لڑکیاں سمجھتے ہیں بلکہ عرب جنازہ اُٹھانے والے کو ابن النعش کہتے ہیں اور عربی محاورے میں ابن النعش کی جمع بنات النعش آتی ہے۔

[2] روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں یعنی بے نور ہو گئیں۔

[3] سب رقیبوں سے ہوں ناخوش الخ: اور سب عشاق اپنے اپنے رقیبوں سے ناخوش ہوں تو ہوں لیکن زلیخا اپنے رقیبوں سے (اشارہ ہے ان عورات کی طرف جو حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ایسی محو ہو گئی تھیں کہ انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے) ناخوش نہیں ہے۔

میں چمن میں کیا گیا۔ گویا۔ دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے۔ غزل خواں ہو گئیں

وہ[له] نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار؟
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ۔ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں۔ تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے! وہ۔ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں۔ ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں۔ تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم۔ کہ ویراں ہو گئیں

[له] اس شعر میں استفہام استعجابی ہے۔ نگاہیں دور تک جا سکتی ہیں۔ لیکن پلکیں نہیں جا سکتیں۔ نگاہیں مژگاں ہو گئیں سے شاعر کا مطلب یہ ہے کہ نگاہیں کوتاہ ہو گئیں یعنی شرم سے میری جانب نہیں اٹھتیں اور پھر بھی دل کے پار ہوئی جاتی ہیں اس کا سبب وہ بہ استعجاب پوچھتا ہے ۔۔

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں — یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے — دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

3 ملنا ترا[۱] اگر نہیں آساں تو سہل ہی — دشوار تو یہی ہی کہ دشوار بھی نہیں

4 بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہی اور یہاں — طاقت بہ قدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں

5 شوریدگی کے ہاتھ سے ہی سر وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

6 گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف — یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

7 ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان — آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

8 دل میں ہی یار کی صفِ مژگاں سے روکشی[۲] — حالاں کہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

9 اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہی تو ہشیار بھی نہیں

۱؎ مرزا غالب کے اس مشہور شعر کا مطلب لکھنے میں سب نے قریب قریب ممکن الوقوع اور ناممکن الوقوع کی بحث کی ہی رشک اور ہجر کا مضمون کسی کے ذہن میں نہیں گزرا جیسا کہ مندرجہ ذیل شرح سے جو خود مرزا نے اپنے ایک خط میں لکھی ہی ظاہر ہوتا ہی۔ مرزا لکھتے ہیں:- "تیرا ملنا اگر آسان نہیں ہی تو یہ امر مجھ پر آسان ہی۔ خیر تیرا ملنا آسان نہیں نہ سہی نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکیگا۔ مشکل تو یہ ہی کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں۔ یعنی جس سے تو چاہتا ہی مل بھی سکتا ہی۔ ہجر کو تو ہم نے سہل سمجھ لیا تھا مگر رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے"

۲؎ روکشی:- مقابلہ۔ ایک شارح صاحب نے روکشی کو "رو کشی" لکھ کر مطلب غلط لکھا ہی "روکشی" تمام نسخوں میں موجود ہی جس کے معنی مقابلے کے ہیں۔ مطلب یہ ہی کہ دل میں اگرچہ خلشِ خار کی بھی طاقت موجود نہیں مگر

۱ نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس۔ رشتہ چشمِ سوزن میں

۲ ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ۔ روزن میں

۳ ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے۔ مرے ہر قطرہ خوں۔ تن میں

۴ بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو۔ جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

۵ نکوہش۔ مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب۔ بخیہ جیب و دامن میں

لیکن یار کی صفِ مژگاں سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہے۔۱۲

لہ بخیے کے درخور: بخیے کے لائق۔ مطلب یہ ہے میرے تن میں کوئی زخم بخیے کے لائق نہیں ہے میرے زخموں کی حالت دیکھ کر سوئی کو یاس ہوئی تو اس کا تاگا تارِ اشکِ یاس بن گیا۔۱۲

سلہ کفِ سیلاب: سیلاب کے جھاگ۔ اُس سیلاب کے جھاگ جس سے خانہ ویرانی ہوئی دیواروں کے سوراخوں میں باقی رہ گئے ہیں وہ جھانکنے کے مانع ہیں۔ بلکہ صفی اکثر مسبب کو سبب قرار دیتے اس لیے شاعر نے اس موقعے پر خانہ ویرانی کو مانعِ تماشا کہا ہے۔۱۲

ستہ ہر قطرۂ خوں میرے تن میں ایک نگینہ ہے جس پر مژگانِ معشوق نے اس کا نام کھود دیا ہے اور میں گویا معشوق کی کاوشوں کے ظلم کا ودیعت خانہ بنا ہوا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس کی کاوشوں کے ظلم کا امانت دار ہوں۔ (یہ قاعدہ ہے کہ امانت پر مہر لگا دیتے ہیں) اور اسی لیے اُس کو افشا نہیں کرتا۔۱۲

سکہ شاعر کہتا ہے کہ اُس کے گھر میں اس قدر تاریکی ہے کہ اگر اس کی دیوار کے روزن میں پنبہ رکھ دیا جائے تو ایسا معلوم ہو کہ چاند نکل آیا۔۱۲۔ شہ ملامتِ احباب میرے جوشِ جنوں کو مانع ہوئی یعنی چند احباب کے خیال سے میں نے

ہوئے[1] اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَرافشاں - جوہر آئینہ میں - مثلِ ذرّہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں - پر صحبت مخالف ہے
جو گُل ہوں - تو ہوں گلخن میں - جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا - ہر قطرہ خوں - تن میں

اَسدؔ - زندانیِ تاثیر اُلفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش - ہو گیا ہے طوق - گردن میں

مِرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر - سو - جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر - ہوا اُڑا لے جائے
وگرنہ - تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟
کہ غیرِ جلوۂ گُل رہ گزر میں - خاک نہیں

جیب و دامن چاک نہیں کیا اس لیے ملامت کرنے والے احباب کا خندۂ دنداں نما بخیۂ گریبان ہو گیا خندۂ دنداں نما کو بخیے سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے ۱۲

[1] اس شعر کے نثر کر دینے سے اس کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے - اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے جوہر آئینے میں (اس طرح) پرافشاں ہوئے (جس طرح) ذرّے روزن میں (شعاعِ آفتاب سے) اُڑتے ہیں ۱۲

بھلا اُسے نہ سہی - کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں مےکش
شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھُلا - کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے - نہ سنگ و خشت - درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار - کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دیر نہیں - حرم نہیں - در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم - غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دل فروز - صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز - پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ - جاں ستاں - ناوکِ ناز - بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی - سامنے تیرے آئے کیوں؟

لہ نظارہ سوز: جس کا نظارہ نہ ہو سکے ۱۲

قیدِ حیات و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی۔ غم سے نجات پائے کیوں؟

حسن اور اُس[لہ] پہ حُسنِ ظن۔ رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے۔ غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز۔ یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خداپرست۔ جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہوں دین و دل عزیز۔ اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر۔ کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

غنچۂ ناشگفتہ کو۔ دور سے مت دکھا۔ کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں۔ منہ سے مجھے بتا۔ کہ یوں

لہ بوالہوس، ہوسناک۔ رقیب کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ غیر سے بھی رقیب مراد ہے۔
مؤلف نے اپنے ایک خط میں، اس شعر کو الفاظ ذیل میں صاف کر دیا ہے:۔
حسنِ عارض و حسنِ ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس [illegible] بھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو اپنی نسبت ہے کہ میرا وار کبھی اوچھا نہیں اور میرا تیرِ غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس جب اس کو ایسا بھروسا ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے۔ اس حسنِ ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی۔ ورنہ رقیب عاشقِ صادق نہ تھا اگر بیچ میں امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی۔ ۱۲۔

پرسشِ طرزِ دل بری کیجیے کیا؟ کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے۔ ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے۔ پر نہ کرے خدا کہ یوں

"غیر سے رات کیا بنی"۔ یہ جو کہا۔ تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا۔ اور یہ دیکھنا۔ کہ یوں

بزم میں۔ اُس کے روبرو۔ کیوں نہ خموش بیٹھیے
اُس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح؟"
دیکھ کے میری بےخودی۔ چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی؟
آئنہ دار بن گئی۔ حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال۔ وصل میں شوق کا زوال؟[1]
موجِ محیطِ آب میں۔ مارے ہے دست و پا کہ یوں

---

[1] شاعر معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگر تیرے دل میں یہ خیال ہو کہ وصل میں شوق کیوں کم ہو جاتا ہے تو تجھے موجِ بحر کو دیکھنا چاہیے کہ وہ وصل بحر سے علیحدہ ہو کر کنارے پر پہنچنے کے لیے دست و پا مار رہی ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

ردیف (و)

[1] حسد سے دل اگر افسردہ ہے۔ گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ۔ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

[2] بہ قدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سرو قد۔ گرمِ خرامِ ناز آجاوے
[3] کفِ ہر خاکِ گلشن۔ شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

[1] گرمِ تماشا ہو: یعنی دنیا کو دیکھ۔ چشمِ تنگ۔ حاسد کی صفات میں سے ہے حاسد ہمیشہ تنگ چشم اور تنگ دل ہوتا ہے شاعر کہتا ہے کہ جس قدر انسان کو دنیا کا زیادہ تجربہ ہوگا اُسی قدر وسیع النظر ہوگا۔ وہ وسیع النظری اور فراخدلی ہی مرضِ حسد کا علاج ہے ۱۲

[2] بھروں: آلودہ کروں۔ آبِ ہفت دریا: کثرتِ معاصی کی طرف استعارہ ہے۔ تردامن: اصطلاح فارسی میں گنہگار کو کہتے ہیں ۱۲

[3] کفِ ہر خاک: یعنی ہر کفِ خاک ۱۲۔

کعبے میں جا رہا۔ تو نہ دو طعنہ۔ کیا کہیں
بھولا ہوں۔ حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو؟
طاعت[1] میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو۔ کوئی لے کر بہشت کو۔
ہوں منحرف[2] نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہے قط۔ قلمِ سرنوشت کو
غالب۔ کچھ اپنی سعی سے۔ لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے۔ اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ[3] اس سے ہیں۔ کہ محبت ہی کیوں نہ ہو؟
کیجے ہمارے ساتھ۔ عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

---

[1] اس شعر میں غالب نے اپنے اس فلسفیانہ مسلک کا اظہار کیا ہے کہ اگر جنت کا تصور مٹ جائے تو پرہیزگار دل میں زیادہ خلوص پیدا ہو جائے اور ان کی عبادت کی محرک حور اور شراب طہور کی آرزو نہ رہے۔
[2] یعنی تقدیر میں یہ لکھا ہے کہ ثواب کے رستے پر نہ چلیں ۱۲
[3] وارستہ۔ بے پروا۔ آزاد ۱۲

"پیدا ہوئی ہے" کہتے ہیں "ہر درد کی دوا"
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو؟

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ[1]
اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو؟

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں۔ خلوت ہی کیوں نہ ہو؟

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے۔ انفعال[2]
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو؟

وارستگی۔ بہانۂ بیگانگی نہیں[3]
اپنے سے کر۔ نہ غیر سے۔ وحشت ہی کیوں نہ ہو؟

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی؟[4]
عمرِ عزیز۔ صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو؟

---

[1] یہ میری بے کسی کا احسان ہے کہ مجھے کسی کا ممنون احسان ہونا نہیں پڑا۔ اپنے سے کھینچتا ہوں یعنی اپنے سے خجل کرتا ہوں۔ مطلب یہ کہ خجالت بھی مجھے دوسروں سے نہیں اٹھانا پڑی بلکہ اگر خجالت بھی ہے تو اپنے ہی سے ہے ۱۲-

[2] منفعل ہونا یعنی دوسروں کا اثر قبول کرلینا زبونی ہمت یعنی کم ہمتی ہے اس لیے زمانہ کے آثار و حوادث سے بھی عبرت نہ حاصل کر کیونکہ یہ بھی پست ہمتی اور عجز کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو اپنے کیریکٹر اور اخلاق کو اس قدر اعلیٰ درجہ کا بنالے کہ دنیا کے کسی واقعہ سے تجھے عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے ۱۲

[3] یہ شعر بھی علیٰ درجہ کا اخلاقی شعر ہے شاعر کہتا ہے کہ آزادی اس کا نام نہیں ہے کہ تو ترکِ تعلقات کرکے لوگوں سے وحشت کرنے لگے۔ اگر وحشت کرتا ہے تو اپنے نفس سے وحشت کر نہ کہ غیر سے یعنی [illegible]

اُس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

لہ قفس میں ہوں۔ گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو

مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو؟

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو۔ یہ رشک کیا کم ہے؟

نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست۔ دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس جراحت پر

کیا سینے میں جس نے خوں چکاں مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں

کبھی میرے گریباں کو۔ کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں

نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

اُس سے کچھ اور بڑھ کر بھی انسان حاصل کر سکتا ہے۔ پھر محض عبادت ہی میں اگر زندگی کو صرف کر دیا جائے تو اس کا غم دل سے کیونکر جا سکتا ہے ۱۲۔

لہ شاعر کہتا ہے کہ میں تو قفس میں ہوں اور نوا سنجانِ گلشن آزاد ہیں اس لیے لطفِ چمن میں میں ان کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔ میں قفس میں بند پڑا ہوا نالے کرتا ہوں اور وہ آزادی میں نوا سنجی یعنی ترانۂ مسرت گاتے ہیں اور میرے یہ نالے مرغانِ چمن کے لیے نقصان رساں نہیں بلکہ میرے نالوں سے کچھ نہ کچھ ان کے چمن کی رونق ہی ہے ۱۲۔

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا ؟ کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں - کہ ڈھونڈھے ہو ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری[لہ] بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہو
مرے بت خانہ میں - تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں - جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو - تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا ؟
رہا کھٹکا نہ چوری کا - دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے ؟ کہ جویاں ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے ؟ کہ کھودیں جاکے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں **غالب**
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

دھوتا ہوں - جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہو ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے - پاؤں

لہ برہمن کا بت خانہ میں مرنا اس کی استواری عہد اور وفاداری کی دلیل ہو اور چونکہ استواری

دی سادگی سے جان- پڑوں کوہکن کے پانو

ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو؟

بھاگے تھے ہم بہت- سو اسی کی سزا ہے یہ

ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور

تن سے سوا فگار ہیں- اس خستہ تن کے پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ

ہلتے ہیں خود بخود- مرے- اندر کفن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک- کہ ہر طرف

اڑتے ہوئے الجھتے ہیں- مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں

دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو؟

پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

عہد اور وفاداری ہی اصل ایمان ہے اس لیے ایسے ایمان دار کا دفن کعبہ ہو ۱۲

لہ مرغِ چمن یعنی پرندہ تو ہمیشہ اوپر سے اڑتا ہے پھر پاؤں الجھنا کیسا؟ لیکن یہ کنایہ ہے اس طرف کہ باغ میں اس قدر جوشِ گل اور بہار ہے کہ جو مرغانِ چمن اس پر سے گزرتے ہیں ان کا دل آگے بڑھنے کو نہیں چاہتا اور وہ وہیں گر پڑتے ہیں ۱۲

واں اُس کو ہولِ دل ہے۔ تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا[1] نہیں۔ ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

واں[2] پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ۔ آہنگِ۔ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

دل کو میں۔ اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز۔ تو سم ہے ہم کو

رشکِ[3] ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر۔ تیغِ دو دم ہے ہم کو

[1] نخچیر بمعنی شکار مثل آہو وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کا ذوقِ ستم تو دیکھیے کہ جب تک دیدۂ نخچیر کا آئینہ نہ ہو وہ اپنے کو نہیں دیکھتا یعنی دیدۂ نخچیر کے آئینہ کے سوا وہ اپنی صورت کسی دوسرے آئینہ میں دیکھنا پسند نہیں کرتا یہ انتہائے ذوقِ ستم ہے ۱۲

[2] پئے ہم۔ متواتر۔ اگر یہ لفظ بلا اضافت بولا جائے تو اس کا املا پیہم صحیح ہوگا۔ اس شعر میں مرزا نے اضافت کے ساتھ استعمال کیا ہے کیونکہ اس لفظ کا استعمال فارسی میں اضافت کے ساتھ اور بلا اضافت دونوں طرح آیا ہے لیکن آج کل اُردو کا محاورہ یہی ہے کہ بلا اضافت بولتے ہیں۔ صد رہ: سو بار۔ شاعر کہتا ہے کہ معشوق کے کوچے میں پہنچ کر جو مجھے متواتر غش آتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سو سو طرح سے اپنے قدموں کی زمیں بوسی کروں کیونکہ انھیں قدموں کی بدولت کوچۂ محبوب نصیب ہوا ۱۲

[3] مصرعۂ اول میں ہم طرحی، درد، و اثر دونوں لفظ بانگ کے مضاف ہیں۔ بس اسی نکتہ کے سمجھنے سے سارا شعر سمجھ میں آجاتا ہے اور تیغِ دو دم کا مطلب صاف ہو جاتا ہے ۱۲

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا۔
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو۔
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

قطعہ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا۔ سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں۔ ایک توقع **غالب**
جادۂ رہ۔ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے۔ تو تم گواہ ہو

کیا وہ[1] بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں۔ خورشید و ماہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا۔ تو پھر اب کیا جگہ کی قید؟
مسجد ہو۔ مدرسہ ہو۔ کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف۔ سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

[1] مصرعۂ اول میں ضمیر "وہ" مصرعۂ ثانی کے الفاظ خورشید و ماہ کی طرف راجع ہے ۱۲

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب! اور مرا بادشاہ ہو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو۔ تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو۔ تو کیوں کر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام۔ وصال
کہ گر نہ ہو۔ تو کہاں جائیں ہو۔ تو کیوں کر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش۔ تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گو مگو۔ تو کیوں کر ہو

تمہیں کہو۔ کہ گزارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو۔ تو کیوں کر ہو

اُلجھتے ہو تم۔ اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو۔ تو کیوں کر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

ہمیں پھر اُن سے اُمید۔ اور اُنھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو۔ تو کیوں کر ہو

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

مجھے جنوں نہیں **غالب**۔ ولے بقولِ حضور
له فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو؟

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینے میں۔ تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

له یہ مصرعہ بادشاہ ظفر کا ہے مرزا نے بادشاہ کی خواہش سے یہ غزل لکھی تھی۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے۔ ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں؟ کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو؟

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی۔ وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

[۱] یہ کہہ سکتے ہو؟ "ہم دل میں نہیں ہیں"۔ پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو۔ تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

غلط ہے جذب دل کا شکوہ۔ دیکھو جرم کس کا ہے؟
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

[۲] یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

۱؎ پہلے مصرعے میں استفہام انکاری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات تم کہہ نہیں سکتے کہ تم میرے دل میں نہیں ہو۔ یعنی یہ کہنا پڑیگا کہ تم میرے دل میں ہو لیکن دریافت طلب یہ ہے کہ جب میرے دل میں تم اور صرف تم موجود ہو تو آنکھوں سے پوشیدہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟

۲؎ یہ فتنہ: اشارہ ہے۔ معشوق کے دوست ہو جانے کی طرف۔

یہی ہے آزمانا۔ تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لیے جب تم۔ تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

کہا تم نے۔ کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"
بجا کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو۔ پھر کہیو کہ "ہاں کیوں ہو"

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ؟
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر۔ جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار۔ تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ردیف (ہ)

[1] از مہر تا بہ ذرّہ - دل و دل ہی آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہی آئینہ

[2] ہی سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

[3] ناچار بے کسی کی بھی حسرت اُٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

ردیف (ی)

صد جلوہ رو بہ رو ہی - جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

[1] آفتاب سے لیکر ذرّے تک دنیا میں ہر چیز دل کے مثل ہو اور دل بشکل آئینہ ہو - پس گویا ہر طوطی کو ہر سمت آئینہ مقابل نظر آتا ہو - طوطی سے مراد انسان ہی جو شیدائے آئینۂ دل ہو۔

[2] میرے غم کدے کے در و دیوار سبزہ زار بن گئے ہیں یہ ظاہر ہو کہ در و دیوار پہ سبزہ صرف اُس وقت اُگتا ہی جب وہ بے غوری اور بے رونقی کی حالت میں ڈھنڈھار پڑے ہوئے ہوں - شاعر نے اپنے غم خانے کی حالت کی اس شعر میں تصویر کھینچی ہو اور چونکہ سبزہ بہار میں اُگتا ہو اس لیے مصرعہ ثانی میں اپنی اس ویرانی کو بہار کہہ کر آیندہ اس کے بد سے بدتر ہو جانے کا خیال ظاہر کیا ہی۔

[3] منزل مقصود تک پہنچنے کا رستہ ایک تو یوں ہی دشوار گزار تھا پھر اُس پر ساتھیوں کا ستم مزید ہی

ہی تنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

دیوار۔ بارِ منت مزدور سے ہی خم
ای خانماں خراب احساں اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ۔ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہی کس روسیاہ کو؟
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہی رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

ق

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رو سوئے قبلہ۔ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

نشو و نما ہی اصل سے۔ غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہی۔ جو بات چاہیے

چونکہ ہمارے ساتھ ہم سفر جا رہے وہ ستم ہی کرنے والے کیوں نہ ہوں موجود ہیں۔ اس لیے ہم اپنے کو بے کس بھی نہیں کہہ سکتے۔۔۔ پس مجبوراً بے کسی کی حسرت اٹھاتے ہیں ۱۲

ملہ برات ا۔ بمعنی فرمان جس کے بموجب خزانہ سے روپیہ ملے۔ مطلب یہ ہی کہ چونکہ جنونِ عشق کے لیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں - وہ بھی
سو رہتا ہی باندازِ چکیدن - سرنگوں وہ بھی

رہی اُس شوخ سے آزردہ ہم - چندے تکلف سے
تکلّف برطرف - تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ - کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنّا میں ہی اِک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاشس نالہ - مجھ کو کیا معلوم تھا؟ ہمدم!
کہ ہوگا باعثِ افزایشِ دردِ دروں وہ بھی

نہ اِتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بے تابی میں ہی اِک موجِ خوں[2] بھی

مَے عشرت کی خواہش - ساقیِ گردوں سے کیا کیجے؟
لیئے بیٹھا ہی اِک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہی غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دِن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں[1] وہ - بھی

ہے[1] بزمِ بتاں میں - سخن آزردہ - لبوں سے
تنگ آے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

نشانۂ سنگِ طفلاں ہونا لازمی ٹھہرا ہوا ہے اسلیے گویا جنون میں بھی لڑکوں کی منت کشی کے بغیر مفر نہیں ۲۔
[1] خوشامد طلبوں سے معشوق کی طرف اشارہ ہی مطلب یہ ہو کہ معشوقوں کی خوشامد کرتے کرتے سمع

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
۱ یک بار لگادو خُمِ مے - میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ - گستاخ ہیں - زاہد
۲ زنہار نہ ہونا طرف - ان بے ادبوں سے

بے دادِ - وفا دیکھ - کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں - گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

غالب - ترا احوال سنادیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بلالیں - یہ اجارا نہیں کرتے

گھر میں تھا کیا ؟ کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم - اِک حسرتِ تعمیر - سو ہے

لبوں سے آزردہ ہے یعنی خوشامد کی حد ہو گئی اب بات کرنے کو جی نہیں چاہتا ۱۲

۲ طرف ہونا - پُرانا محاورہ ہے - بہ معنی منہ لگنا ۱۲

۳ جاتی - رہان جاتی - جان کو لبوں سے ربط تھا - یعنی جان لبوں پر رہا کرتی تھی ۱۲

ملہ
غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی
فلک کا دیکھنا۔ تقریب تیرے یاد آنے کی

ملہ
کُھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یا رب!
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت۔ دل میں سوزِ غم چھپانے کی

اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو۔ دیکھنا۔ شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی۔ التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا۔ ظالم۔ مگر تمہید جانے کی

ملہ چونکہ فلک بھی ستمگر مشہور ہے اور تو بھی ظالم ہے اس لیے قدرتی طور پر فلک کو دیکھتے ہی تیری یاد آتی ہے ۱۲

ملہ خط کے جلانے سے میرے سوزِ غم کا حال معشوق پر ظاہر ہو جاتا تھا۔ لیکن اب چونکہ اس نے خط کا جلانا بھی موقوف کر دیا ہے اس لیے میرا مطلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس شعر کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عشاق اپنے خطوط خفیہ طریقے پر تحریر کرنا پسند کرتے ہیں جس سے افشاء راز کا خوف باقی نہ رہے اور اس لیے وہ کسی ایسی روشنائی کو استعمال کرتے ہیں جس کے حروف بادی النظر میں نہ دیں نظر لیکن آگ کو دکھاتے ہی پڑھنے میں آ جائیں پیاز کا عرق بھی اس مطلب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس سے لکھے ہوئے حروف کاغذ کو آگ پر رکھتے ہی روشن ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بھی ہمیشہ اسی روشنائی سے اپنے معشوق کو خط لکھا کرتا تھا اور معشوق اس کو آگ پر رکھ کر پڑھ لیا کرتا تھا۔ لیکن اب چونکہ معشوق نے کاغذ کے جلانے کی قسم کھائی ہے اس لیے اسے فکر ہے کہ اب معشوق پر اس کے خط کا مطلب کس طرح واضح ہوگا ۱۲

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت۔ کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ؟
بدی کی اُس نے۔ جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

حاصل[1] سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے۔ ڈوبی ہوئی اسامی

اُس[2] شمع کی طرح سے۔ جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

کیا تنگ[3] ہم ستم زدگاں کا جہان ہے!
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

[1] حاصل: بہ معنی حصول۔ ہاتھ دھو بیٹھ: نا امید ہو جا۔ آرزو خرامی سے مراد خرام حسب آرزو ہے۔ اسامی جمع ہے اسم کی لیکن اردو میں یہ لفظ بہ معنی کاشتکار بطور مفرد استعمال ہوتا ہے ڈوبی ہوئی اسامی اُس کاشتکار کو کہتے ہیں جو آفات ارضی یا سماوی سے برباد ہو جائے اور مالک اراضی کو اس سے لگان وصول ہونے کی امید باقی نہ رہے مطلب یہ ہے کہ گریہ و زاری سے کوئی ایسا نتیجہ حاصل نہ ہوگا کہ اپنے حسب مراد خرام کر سکوں کیونکہ جوش گریہ نے دل کو ڈوبی ہوئی اسامی بنا دیا ہے یعنی اثر سے مایوس کر دیا ہے ۱۲

[2] میں داغ ناتمامی ہوں: یعنی مجھے اپنے ناتمام رہ جانے کا داغ ہے ۱۲

[3] مطلب یہ ہے کہ ہم اس قدر ستم زدہ ہیں کہ چیونٹی کا ایک بے حس و حرکت انڈا بھی ہم پر ظلم کرنے کو آسمان بنا ہوا ہے۔ ۱۲

حالاں کہ ہے یہ سیلیِ خارا[1] سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند؟ کہ ٹھنڈا مکان ہے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں؟ کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالب - ہم اس میں خوش ہیں - کہ نامہرباں ہے

درد[2] سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے!
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری؟ ہائے ہائے

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے

۱؎ سیلی خارا: ضربِ سنگ: اگر اس شعر میں سیلی خارا کو حوادث کے تھپیڑوں اور شیشے کو شیشۂ دل سے تعبیر کیا جائے تو مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ ۱۲

۲؎ یہ پوری غزل معشوق کی وفات پر بطور مرثیہ لکھی گئی تھی۔ ۱۲

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اِک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال
ہے نظر۔ خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام۔ و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا۔ غالبؔ۔ ابھی اُلفت کا رنگ
رہ گیا۔ تھا دِل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہی
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہی

لیتا[۱] نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہی کہ میرے ہی پاس ہی

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہی

ہی[۲] وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہی

پی[۳] جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہی

ہر اک مکان کو ہی مکیں سے شرف **اسد**
مجنوں جو مر گیا ہی تو جنگل اداس ہی

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہی
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہی

کس[۴] کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہی

[۱] میرے ہی پاس ہی یعنی عاشق کے پاس ہی ۱۲
[۲] دلِ حق شناس سے خود عاشق کا حق شناس دل مراد ہی جو معشوق نے لے لیا ہی ۱۲
[۳] اس شعر میں شبِ ماہ کے ساتھ بلغمی مزاج کو اس رعایت سے باندھا ہی کہ شبِ ماہ کے مزاج کو بھی مرطوب کہا جاتا ہی ۱۲
[۴] کہتے ہیں کہ میں اپنے بیانِ حال کی حسرت کا شکوہ کس کے سامنے کروں۔ میرا دل گویا دہنوں کے جمع خرچ کی فرد ہی۔ یعنی اُن احباب کے شکووں کا دفتر بنا ہوا ہی جو نہ سنتے ہیں نہ جواب دیتے ہیں ۱۲

کس[1] پردے میں ہے آئنہ پرداز اے خدا!
رحمت۔ کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے خدا نہ خواستہ وہ اور دشمنی!
اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے؟

مشکیں لباسِ کعبہ۔ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی[2] کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دِلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

---

[1] اس شعر میں آئنہ پرداز کی فاعل "رحمت" ہے اور اس کی شرح یہ ہے:- اے خدا تیری رحمت کس پردے میں آئینہ پرداز یعنی اپنی آرائش میں مصروف ہے کہ لبِ بے سوال عذر خواہ ہے کہ میں نے سوال اب تک کیوں نہ کیا۔

[2] لباسِ کعبہ کو مشکیں اس کے غلافِ سیاہ کی نسبت سے کہا اور یہ رعایت بھی ملحوظ ہے کہ جس طرح سے

ایک [1] جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا۔ غلط بردار ہی

جی [2] جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں؟
ہم نہیں جلتے۔ نفس ہر چند آتش بار ہی

آگ [3] سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہی صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہی

ہی وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عذرخواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہی

مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہی

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہی۔ کہ تا
تجھ پہ کھُل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہی

مشک کی خوشبو پھیلتی ہی اسی طرح کعبہ کی برکت دنیا میں پھیل رہی ہی۔ دوسرے مصرعے میں مشکیں کی رعایت سے نافِ غزال کا لفظ استعمال ہوا ہی۔

[1] غلط بردار یعنی کاٹ اُٹھانے والا۔ مطلب یہ ہی کہ معشوق نے اپنے خط میں ایک جگہ جھوٹ موٹ حرفِ وفا لکھا تھا وہ مٹ گیا ایسا معلوم ہوتا ہی کہ تیرے خط کا کاغذ وہ چیز ہی جس سے کاتب حرفِ غلط اُٹھا لیتے ہیں۔

[2] اس شعر میں مرزا نے مسئلہ دورانِ خون کی شرح لکھی ہی۔ وہ کہتا ہی کہ ہر نفس سینے میں اشتعال پیدا کرتا ہی۔ اور وہی اشتعال انسانی زندگی کے قیام کا باعث ہی گویا فطرتاً ہر انسان ذوقِ فنا رکھتا ہی لیکن شاعر اپنے ذوقِ فنا کو ناقص بتا کر کہتا ہی کہ اس پر جی جلتا ہی کہ ہم باوجود اپنے نفس کی آتش باری کے یکبارگی جل کر فنا نہیں ہو جاتے۔

[3] نالہ سے ناچار ہی فارسی محاورہ نالہ ناچار از نالہ کا ترجمہ ہی یعنی بے بسی جس کی خاموشی مسلم ہی درماندگی میں چیخ اُٹھتی ہی۔

^لہ^ پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے	کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

^۲^ مری ہستی - فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو؟
وہی ہم ہیں قفس ہے - اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتّفاقی - ورنہ اے ہمدم!
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے؟

^۳^ نہ لائے شوخیٔ اندیشہ - تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنّا ہے

لہ اس شعر میں سوا کندھا بدلنے کی محاورے کے کوئی تخیل نہیں ہے بدلنے کے ساتھ کندھا بولتے ہیں اور دینے کے ساتھ کاندھا - خیال کے اعتبار سے یہ شعر کلامِ غالب کے پایہ سے گرا ہوا ہے اور سارے دیوان میں صرف یہی ایک شعر ایسا ہے ۱۲

سلہ شاعر نے اپنی ہستی کو حیرت آباد تمنّا کی فضا اور چونکہ حیرت کے عالم میں انسان کے منہ سے آواز نہیں نہیں نکل سکتی اس لیے نالے کو اس نے عالم حیرت کا عنقا قرار دیا ہے - مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی تمنّا میں ایسا محو ہے کہ نالہ تک منہ سے نہیں نکل سکتا ۱۲ -

سہ شاعر کہتا ہے کہ میری فکر کی شوخی سے ناامیدی اور مایوسی کا صدمہ نہیں اٹھ سکا - اگر ناامیدی کے بعد کفِ افسوس بھی ملا تو وہ گویا تجدید تمنّا کا پیمان ہوگیا یعنی جس حیرت کا افسوس کیا پھر اسی کی تمنّا کی - عاشق کی استقلال اور الوسی کا بیان ہے کفِ افسوس ملنے کے ساتھ تجدید عہد تمنّا کہنا اس لیے بھی زیادہ پرلطف ہوگیا ہے کہ عہد باندھنے کے وقت ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں ۱۲

[1] رحم کر ظالم۔ کہ کیا بودِ چراغِ کُشتہ ہی	ق	نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کُشتہ ہی
دل لگی کی آرزو بیچین رکھتی ہی ہمیں		ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کُشتہ ہی

[2] چشمِ خوباں۔ خامشی میں بھی نوا پرداز ہی
سُرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہی

[3] پیکرِ عُشاق۔ سازِ طالعِ ناساز ہی
نالہ۔ گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہی

[4] دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گُل۔ فرشِ پا انداز ہی

عشق مجھ کو نہیں۔ وحشت ہی سہی	میری وحشت۔ تری شہرت ہی سہی

[1] بود بہ معنی ہستی۔ چراغ کشتہ استعارہ ہی بیمار وفا سے۔ شاعر نے چراغ کشتہ سے نسبت دیکر اپنی ضعیف العمری کی طرف اشارہ کیا ہی اور بتایا ہی کہ اس عمر میں اگرچہ معشوق سے علیحدہ ہی رہنے اور اپنی حرارت عزیزی کو محفوظ رکھنے ہی میں فائدہ ہی جس طرح سے چراغ کا فائدہ اُس کے خاموش رہنے ہی میں ہی یعنی جس وقت تک چراغ جلتا نہیں اس کا تیل صرف نہیں ہوتا۔ لیکن نہیں اگر کچھ نہیں تو صرف دل لگی کے لیے معشوق کے وصل کی آرزو رہتی ہی ۱۲۔ [2] نوا پرداز = بولنے والی تو کہوے۔ تو گوئی کا ترجمہ ہی یہ ایرانی محاورہ ہی۔ چشمِ ناز کی سخن گوئی کے لحاظ سے سرمے کو شعلۂ آواز کا دھواں کہا ہی ۱۲۔ [3] گردش سیارہ سے یہاں سیارہ کی بدبختی مراد ہی۔ عشاق چونکہ ہمہ تن نالہ و فریاد ہوتے ہیں اس لیے عاشقوں کے پیکر (جسم) کو طالع ناساز یعنی بدبختی کا ساز کہا۔ اہلِ فن کے یہاں مقام عشاق ایک راگنی کا نام ہی اس لیے عشاق اور ساز کی مناسبت لفظی ظاہر ہی ۱۲

[4] مجنون کے دیدۂ خوں بار کی یہ کیفیت ہی کہ سرخی کی وجہ سے یہ گمان ہوتا ہی کہ اس کے فرش کا پا انداز گویا کثرت جلوۂ گُل سے بنا ہوا ہی۔ یک بیاباں بہ معنی کثرت استعمال ہوا ہی۔ دست گاہ اور پا انداز یہ دونوں لفظ

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے / کچھ نہیں ہے۔ تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ / اے وہ مجلس نہیں۔ خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے / غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

لہ اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو / آگہی گر نہیں۔ غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے۔ برقِ خرام / دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟ / نہ سہی عشق۔ مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے۔ اے فلکِ نا انصاف / آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے / بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ / گر نہیں وصل۔ تو حسرت ہی سہی

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے / صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

ڈھونڈھے ہے اس مغنّیِ آتش نفس کو جی / جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مناسبت لفظی کی صنعت دکھانے کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

لہ یہ شعر حقیقتاً مرزا کے اُن اشعار میں سے ہے جو سہل ممتنع سمجھے جاتے ہیں اسی وجہ سے ارباب معنی ایسے اشعار کی ادائگی کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ واقعی یہ شعر حقیقت عرفانی کا ایک آئینہ ہے اور تصوف کے ایک بڑے مسئلہ کو مرزا نے اس طرح حل کیا ہے۔ پروفیسر مولوی علی احمد خاں صاحب اثیر بدایونی نے اس کا مطلب اس طرح ادا کیا ہے۔ اپنی ہستی سے آگاہی کا تعلق حدیث نبوی (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ) کے موافق عرفان الٰہی کا

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا۔ بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے

کھُلتا کسی پہ کیوں مرے دِل کا معاملہ؟
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا[1] کیے
بیٹھا رہا۔ اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں۔ اور جاؤں در سے ترے بِن صدا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہنِ مَے
مُدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ[2] ہی گزرتی ہے۔ ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے؟

زینہ ہے اور اپنی ہستی سے غافل ہونا بھی تمام احادیث اور اقوال صوفیہ کے موافق وحدت ذاتی کا اعلیٰ پایہ جیسا کہ کسی صوفی کا قول ہے، "خودی مٹی جب ملی خدائی سرسوں پھولی آنکھوں میں" نتیجہ یہ ہے کہ سالک کو ہمیشہ اللہ کا بھی اور غفلت کا تعلق اپنی ہستی سے رکھنا چاہیے"۔

[1] حیا: یہاں بمعنی غیرت استعمال ہوا ہے ۱۲ [2] بے صرفہ: فضول ۱۲

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ "او لئیم"
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے ؟

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو ؟
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے ؟

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو[1]
دینے لگا ہے بوسے بغیرِ التجا کیے

ضد کی ہے اور بات۔ مگر خو بُری نہیں
بھولے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غالب۔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

[2]رفتارِ عمر۔ قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

[3]مینائے مَے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں۔ نہ اقامت کی تاب ہے

[1] شاعر نے اس شعر میں فلسفۂ تعوّد کے اس مسئلہ کو کہ جن افعال کی انسان کی عادت پڑ جائے وہ اس سے اضطراراً سرزد ہوتے رہتے ہیں نظم کیا ہے۱۲ [2] راہِ اضطراب: وہ راستہ جو حالتِ اضطراب میں طے ہو قطع: طے سال و عمر۔ مطلب یہ ہے جس طرح گردشِ آفتاب سے سال کا حساب کیا جاتا ہے۔ غالب کہتا ہے کہ عمرِ رواں کا حساب برق کی رفتار سے کرنا چاہیے گویا عمرِ انسانی کی مقدار چشمکِ برق کے برابر ہے یعنی وہ بہت جلد فنا ہو جانے والی ہے۱۲-

[3] شاعر کہتا ہے کہ مستوں کو صحبتِ شراب میں بہارِ باغ کا لطف آرہا ہے۔ اُن کے لیے مینا لئے سبز سرو ہے اور جلوہ موجِ شراب بالِ تدرو ہے (فارسی میں بالِ تدرو لکۂ ابر کو کہتے ہیں)۱۲-

جا دادِ بادہ نوشیِ رنداں ہی شش جہت[1]	غافل گماں کرے ہی کہ گیتی خراب ہی
نظارہ[2] کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا	جوشِ بہار۔ جلوے کو جس کے نقاب ہی
میں۔ نامراد دل کی تسلی کو[3] کیا کروں	مانا ۔ کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہی

گزرا اسدؔ ۔ مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہی

دیکھنا قسمت ۔ کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہی
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہی
ہاتھ دھو دل سے ۔ یہی گرمی گر اندیشے میں ہی
آبگینہ[4] ۔ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہی

[1] جا داد = بمعنی جائے داد ۔ جو لوگ جلوۂ حقیقت سے بے خبر ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ عالم خراب و ویران ہی حالانکہ بادہ نوشی کے لیے رندوں کے حق میں شش جہت ایک وسیع جا مقام ہی جس میں آزادی اور فارغ البالی کے ساتھ وہ مے نوشی کے مزے اڑاتے ہیں ۱۲

[2] جس کے حسن کے جلوے کے لیے جوشِ بہار نقاب ہو نظارہ اس برقِ حسن کے دیکھنے کی کیا تاب لاسکتا ہی ۔ مطلب یہ ہی کہ جب نقاب کی حالت ہی میں اُس کا حسن دلِ عشاق پر بجلی گراتا ہو تو یہ کس کی تاب و طاقت ہی کہ بے نقاب ہونے پر اُس کا نظارہ کر سکے ۔ معرفت سے بھرا ہوا شعر ہی جوشِ بہار ظہورِ عالم کی طرف اشارہ ہی ۱۲

[3] دل کی تسلی کو = یہاں پر "کو" بمعنی "کے لیے" استعمال ہوا ہی ۔ نامراد غالب نے بے مراد کی جگہ استعمال کیا ہی ۱۲ [4] آبگینہ کو دل سے اور گرمی اندیشہ کو تندیِ صہبا سے مشابہ کیا ہی ۱۲

غیر کو۔ یا رب! وہ کیوں کر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے۔ تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دورِ چشمِ بد۔ تری بزمِ طرب سے۔ واہ واہ!
نغمہ ہو جاتا ہے واں۔ گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل[1]۔ پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم۔ ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سُن کر۔ دلِ رنجور۔ یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر۔ بیٹھا جائے ہے[2]

ہو کے عاشق وہ پری رخ۔ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے۔ جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

---

[1] طرزِ تغافل:۔ یعنی عاشق کا تغافل جو پردہ داریِ عشق کی غرض سے برتا جائے شاعر کہتا ہے کہ ہم اپنے معشوق کے سامنے اس طرز سے رہتے ہیں کہ اُس پر ہمارا عشق افشا نہ ہو یہی عاشق کا تغافل ہے لیکن ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں (یعنی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں) کہ وہ فوراً ہمارے عشق کو تاڑ جاتا ہے۔

[2] "بیٹھا جائے ہے" کے اس شعر میں دو معنی دکھلائے گئے ہیں۔ نقش مدعا کا بیٹھنا۔ یعنی مطلب بر آنا۔ دل بیٹھنا:۔ یاس ہونا بسبب بے طاقتی۔ مگر آخر الذکر معنی زیادہ قرینِ قیاس اور بامحاورہ ہیں ۱۲۔

نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر۔ اتنا ہی[1] کھنچتا جائے ہے
سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے؟

گرمِ فریاد[2] رکھا شکلِ نہالی نے مجھے	تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے
نسیہ[3] و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم	لے لیا مجھ سے مری ہمّتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیِ وحدت ہے۔ پرستاریِ وہم	کر دیا کافر۔ اِن اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گُل کا۔ تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا	عجب آرام دیا۔ بے پر و بالی نے مجھے
کارگاہِ[4] ہستی میں۔ لالہ۔ داغ ساماں ہے	برقِ خرمنِ راحت۔ خونِ گرمِ دہقاں ہے

[1] کھنچتا جائے ہے: اکڑتا جائے ہے (بوجہ ناز)

[2] شکلِ نہالی کو دیکھ کر مجھے معشوق کی یاد آئی اور میں گرم فریاد ہو گیا اور اس گرمی فریاد کے سبب مجھے شب ہائے ہجر کی سردی سے امان ملی۔

[3] مطلب یہ ہے کہ میری ہمّت اس قدر بلند ہے کہ اُس نے نقد دنیا اور نسیہ عقبیٰ کے عوض میں مجھے فروخت کرنا گوارا نہ کیا اس لیے میں اپنی ہمّتِ عالی کے پاس رہا۔ یعنی عالی ہمتی کے سبب میرا رتبہ دونوں عالم سے بالاتر ہے ۱۲۔

[4] مرزا غالب نے ان تینوں شعروں کی شرح لکھتے ہوئے عودِ ہندی میں لکھا ہے کہ "قبلہ ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا ۔
طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا ✦ اسد اللہ خاں قیامت ہے

غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے؟	باوجودِ دلجمعی خوابِ گُل پریشاں ہے داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے
اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب	ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اِک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کیے دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے لیے یہ تینوں شعر بھی انھیں دس پندرہ اشعار میں سے ہیں جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے ان کا مطلب مرزا نے ایک خط میں جو مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام عود ہندی میں چھپا ہے اس طرح لکھا ہے بہ رنگ و مستی میں الخ۔ داغ سامانِ شمعِ انجمن۔ وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو۔ سو جودیت لالہ کی منحصر نقشِ داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے پھر یہ سمجھیے کہ پھول کا درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقان کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لو گرم ہو جاتا ہے مقصود شاعر کا

رنج رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم۔ منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ۔ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر۔ اپنی تمنا پر۔ کہ کس مشکل میں ہے!

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ۔ خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

یہ ہو کہ وجود محض رنج دینا ہے۔ داغ کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے وہی اسے کی راحت کی خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالفت راحت اور صورت رنج (شعر دوم) ہے "گل جب نئی نکلے بصورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول رہے برگ عافیت معلوم یہاں معلوم بہ معنی معدوم ہوا ہو۔ برگِ عافیت بہ معنی مایہ آرام مصرعہ "برگ عیشے بگور خویش فرست" برگ اور سر و برگ بہ معنی ساز و سامان خواب گل بشخصیت گل باعتبار خموشی و برجا ماندگی پریشانی ظاہر ہو یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا غنچہ بصورت دل جمع ہے۔ با وصف جمعیت دل گل کی خواب پریشان ہے۔

(شعر سوم) ہم سے رنج ہے۔ پشت دست صورت عجز اور خس بہ دنداں دکھانا بہ دنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے۔ یعنی جس عالم میں کہ داغ نے پشت زمین پر رکھ دی ہو اور شعلے نے تنکا دانتوں میں لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو" مطلب یہ ہے کہ اس رنج کے برداشت کرنے کی ہم میں تاب و طاقت نہیں ہے اور یہ ہمیں ہلاک کر دے گا۔

لہ شاعر کہتا ہے کہ واماندگی کو ہمارے قدم سے عشق ہو گیا ہے اس وجہ سے ہمارا قدم جو منزل کے راستے میں ہے (منزل سے راہ منزل مراد ہے) آگے نہیں بڑھ سکتا اور اس لیے ہم راستے کی تکلیف کیونکر اٹھائیں ۔۔۔ غالب نے اس

[1] وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

[2] دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی!

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

[3] نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

[4] فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں؟ وہ جوانی کدھر گئی؟

شعر میں معشوق سے اپنے ارمان نکالنے کی درخواست نہایت انوکھے طریقے سے کی ہے وہ کہتا ہے کہ غالب کا شوریدہ دل جس میں تیری تمنا پھنسی ہوئی ہے ایک پیچ و تاب کا طلسم ہے تو اپنی تمنا پر رحم کر اور میرا ارمان نکل جانے دے ۱۲

[1] بادۂ مستانہ سے جوانی مراد ہے اور سحر سے پیری کی طرف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے میں جوانی کی ہوس بجا بوالہوسی ہے ۱۲

[2] گل کترنا یعنی شگوفہ چھوڑنا یعنی کوئی فساد کی بات کرکے آپ علیحدہ ہو جانا ۱۲

[3] شاعر معشوق کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ تیرے رخ پر پہونچ کر نگاہ ایسی مست و خود رفتہ ہوئی کہ دیکھنے والے لذتِ دید سے محروم ہو گئے ۱۲

[4] دی یعنی کل گزشتہ۔ فردا یعنی کل آنے والا دن اور فردائے حشر سے بھی مراد لی جاتی ہے قیامت گزرنا نہایت سختی گزرنا یا خود قیامت کا آجانا۔ مطلب یہ ہے کہ کل گزشتہ کو جس وقت تم ہمارے پاس سے رخصت ہوئے ایسی خود فراموشی اور خود رفتگی ہوئی کہ آج اور کل (یعنی ماضی و مستقبل) کی تمیز باقی نہ رہی ۱۲

تسکیں[1] کو ہم نہ روئیں۔ جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے[2] پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی[3] گری کی شرم کرو آج۔ ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں۔ مَے جس قدر ملے

تجھ[4] سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو۔ اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں۔ کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا۔ کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا!
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

---

[1] تسکیں کو ہم نہ روئیں = تسکینِ دل کا غم نہ کریں ۱۲

[2] میرے پتے سے = میرے مدفن کے پتے سے ۱۲

[3] ساقی گری کی شرم کرو = جھکا کر پلا دو ۱۲

[4] کچھ کلام نہیں = کچھ شکایت نہیں۔ سلام = یعنی سلام شکوہ آمیز۔ اس شعر کا مطلب خود مرزا نے ایک خط میں لکھا ہے جو نہایت دلچسپ ہے ناظرین انہیں کے الفاظ میں اس کو ملاحظہ کریں۔ "شاعر کو ایک

[۱] کوئی دن گر زندگانی اور ہے	اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
[۲] آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟	سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں	پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر	کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
[۳] قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم	وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی	کوئی صورت نظر نہیں آتی

قاصد کی ضرورت ہوئی مگر کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے میں ضامن ہوں کہ ایسی حرکت نہ کریگا غرض اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضا را عاشق کا گمان صحیح ہوا۔ قاصد مکتوب علیہ کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہوگیا۔ کیسا خط کیسا جواب دیوانہ بن کپڑے پھاڑ جنگل کو چلدیا اب عاشق اس واقعہ کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے کسی کی باطن کی کسی کو کیا خبر ہے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ کہیں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا؟"

[۱] میرزا اپنے ایک خط میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں "اس میں کوئی اشکال نہیں۔ لفظ یہی وہی معنی ہیں شاعر اپنا مقصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا۔ مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا خدا جانے شہر میں یا نوحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس چلا جائے ۱۲

[۲] یہ گرمی کہاں: استفہام انکاری ہے ۱۲

[۳] اعمار: جمع عمر۔ مطلب یہ ہے کہ نجوم کے ستاروں کے اثر سے بھی عمریں قطع ہوجاتی ہیں لیکن

[۱] موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

[۲] داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کُچھ ہماری خبر نہیں آتی

[۳] مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس مُنہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

بلائے آسمانی اس سے کہیں بڑھ کر ہے - آسمان کے نہایتِ ظلم کی طرف اشارہ ہے ۱۲

[۱] دوسرے مصرعے میں نیند کے لفظ کو زور دے کر پڑھنے سے مطلب صاف ہو جاتا ہے ۱۲

[۲] دوسرے مصرعے میں استفہام اقراری ہے چارہ گر کی ناسمجھی پر تشنیع کی گئی ہے کہ اگر تجھے داغِ دل نظر نہیں آتا تو کیا بوئے سوخت بھی نہیں آتی - یعنی بوئے سوخت تو ضرور آنا چاہیے ۱۲

[۳] مصرعۂ اوّل میں مرتے ہیں بمعنی دل و جان سے چاہتے ہیں آیا ہے - دوسرے مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ موت ہمارے پاس تک تو آتی ہے لیکن ہم پر اپنا عمل نہیں کرتی یعنی ہماری جان نہیں لیتی ۱۲

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ "مدعا کیا ہے"؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا! کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزۂ و عشوۂ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے - وفا کیا ہے؟

ہاں بھلا کر - ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے؟

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا - دعا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ - کچھ نہیں - **غالب**
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

ہوں کشمکشِ نزع میں - ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں - پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی - سمجھ میں مری آتا نہیں - گو آئے

ظاہر ہی کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے

جلّاد سے ڈرتے ہیں۔ نہ واعظ سے جھگڑتے[1]
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب۔ کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ۔ وہ ملتا نہیں۔ اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار۔ تو کعبے ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر[3]
اچھّے رہے آپ اُس سے۔ مگر مجھ کو ڈبو آئے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہی! **غالب**
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

پھر کچھ اِک دل کو بے قراری ہی	سینہ جویائے زخمِ کاری ہی
پھر جگر کھودنے لگا ناخن	آمدِ فصلِ لالہ کاری ہی
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز	پھر وہی پردۂ عماری ہی

[1] شاعر نے اس شعر میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہی کہ رنج و تکلیف سب خدا کی طرف سے ہی مولانا حالی نے [2] اس شعر کے مصرعۂ ثانی میں بھیس کی جگہ رنگ کا لفظ مقدمہ دیوان حالی میں استعمال کیا ہی ممکن ہی کہ یہی صحیح ہو
[3] اثر گریہ: اثر گریہ کے باب میں۔ مجھ کو ڈبو آئے: میری ذلت کر آئے ۱۲

ق

چشمِ دلّالِ جنسِ رُسوائی — دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اُس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

جنوںؔ تہمت کشِ تسکیں نہ ہو۔ گر شادمانی کی[1]
نمک پاشِ خراشِ دل ہے۔ لذت زندگانی کی

کشاکش[2] ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو۔ فرصت روانی کی

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

نکوہش ہے سزا۔ فریادیِ بے دادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح۔ محشر کی

رگِ[3] لیلیٰ کو۔ خاکِ دشتِ مجنوں۔ ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ۔ دہقاں۔ نوکِ نشتر کی

لہ شادمانی کی:۔ شادمانی حاصل کی۔ سر کہتا ہے کہ اگر تھوڑی سی دیر کو دل نے خوشی حاصل کی تو اس سے ہمارے جنوں پر تسکین حاصل کرنے کی تہمت نہیں لگ سکتی کیوں کہ اس عارضی خوشی نے تو زخمِ دل پر اور بھی نمک چھڑک دیا۔ شاعر نے اس شعر میں اس کلیہ کو نظم کیا ہے کہ تکلیف کی حالت میں اگر تھوڑی دیر کو راحت مل جائے تو انسان کو تکلیف و راحت کے مقابلہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور اس وجہ سے اس کو تکلیف کا احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

عہ آدمی کیسی ہی کوشش کرے مگر ہستی سے آج کوئی آزاد نہیں ہو سکا۔ مثلاً موجِ آب ہے کہ اس کی روانی سے بظاہر اس کی آزادی کا خیال ہوتا ہے۔ لیکن فی الواقع اس کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی ہے شاعر نے اس کی لہروں کو زنجیر سے نسبت دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تعلقات کی کشاکش سے جس قدر آزاد ہونے کی کوشش کی جائے۔ اتنی ہی گرفتاری بڑھتی جاتی ہے۔

عہ ریشگی بمعنی اگنا نہ کہ زخمی ہونا۔ اس شعر میں مصنف نے اس مشہور قصے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ لیلیٰ کی

پرِ پروانہ۔ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا[لہ]
ہوئی۔ مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بے دادِ ذوقِ پرفشانی عرض۔ کیا قدرت؟[عہ]
کہ طاقت اُڑ گئی۔ اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے۔ قیامت ہے
مری قسمت میں یارب۔ کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

بے اعتدالیوں سے۔ سُبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہوگئے[سہ]۔ اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دامِ سخت قریب[کہ] آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

قصہ کے ساتھ مجنوں کی فصد خود بخود کھل گئی تھی مطلب یہ ہے کہ اگر خاکِ دشتِ مجنوں میں کسان دانے کی جگہ نشتر بوئے تو حسن و عشق کے اتحاد کا یہ اثر ہو کہ اُس سے رگِ لیلیٰ اُگ آئے ۱۲

لہ جب مجلس گرم ہوتی ہے تو شمع جلتی ہے اور شمع کے لیے پروانے کا ہونا لازمی ہے اور مجلس کی گرمی روانیِ ساغر کا سبب ہے اس لیے کشتیِ مے کا بادبان پرِ پروانہ کو ٹھہرایا نتیجہ یہ نکلا مجلس میں دورِ ساغر اور کشتیِ مے پروانے ہی کی بدولت چلتی ہے

عہ یہ شعر بسبیلِ تمثیل ہے شاعر کہتا ہے کہ اُڑنے سے پہلے ہی میرے شہپر کی قوتِ پرواز اُڑ گئی (زائل ہوگئی) اب ذوقِ پرفشانی کی بیداد بیان سے باہر ہے کہ پھڑکنا چاہتا ہوں لیکن پھڑک نہیں سکتا ۱۲

سہ جتنے زیادہ ہوگئے: جتنے ہم اپنی حد سے بڑھے ۱۲

کہ سخت قریب: بہت زیادہ قریب۔ اس شعر میں شاعر نے انسان کی اس حالت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آدمی نے جہاں ہوش سنبھالا اور تعلقاتِ دنیوی میں پھنس گیا ۱۲

[1] ہستی ہماری - اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ - آپ ہی اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

[2] اللہ رے تیری تندیِ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ - دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

[3] اہلِ ہوس کی فتح ہے - ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اٹھ گئے - وہی اُن کے علم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے - سو وہ یاں آکے دم ہوئے

---

[1] شاعر اس شعر میں اپنی ہستی کی بے حقیقت ظاہر کرتا ہے کہ وہ برائے نام صرف قسم کھانے کو ہے ورنہ فی الواقع انسانی ہستی فنا کے برابر ہے ۱۲

[2] رزقِ ہم :- ایک دوسرے کا رزق ۱۲

[3] اہلِ ہوس :- رقیب - پاؤں اٹھنا :- بھاگ جانا - علم ہوئے :- فتح کا جھنڈا ہوئے ۱۲

⁂

چھوڑی **اسدؔ** - نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو - عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

۱؎ جو نہ نقدِ داغِ دل کی - کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہو - بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع ؟ بہ زمانہ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے - نہ سُنی مری کہانی
و ۲؎ نہیں دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب - ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب ! ملے میری زندگانی

۳؎ ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر - سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

۱؎ کہتے ہیں کہ شعلہ (شعلۂ محبت) جو میرے نقدِ داغِ دل کی محبت کا فرض ادا کرتا ہو (چونکہ داغ کو اشرفی سے مناسبت دیتے ہیں۔ اس لیے نقدِ داغِ دل کہا) اگر ایسا نہ کرے یعنی اُسے ٹھنڈا ہو جانے دے تو افسردگی (دل خاموشی جو محرومی سے پیدا ہوتی ہو اُسے مٹا دے۔ شعلے کی رعایت سے بے زبانی کا لفظ کہا گیا ہو ۱۲

۲؎ نہیں :- اس لفظ کا املا بعض یوں ہی اور بعض یونہیں لکھتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ جو بولا جائے وہی لکھا جائے "نِہیں" لکھتے ہیں اس کے معنی محاورے میں بے سبب کے ہیں ۱۲۔

۳؎ شبِ غم کا جوش :- اندھیرا ہی اندھیرا۔ اس شعر کی شرح بھی خود مرزا غالب ہی کر گئے ہیں جس کو ہم بجنسہٖ عودِ ہندی سے نقل کیے دیتے ہیں :-

دوسرا مصرعہ خبر ہو پہلا مصرعہ مبتدا "شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا (ظلمتِ غلیظ) سحر نا پیدا گویا

تُو نے کیا ہی - حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق - یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہی

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہی

[1] دیدار بادہ - حوصلہ ساقی - نگاہ مست
بزمِ خیال - میکدۂ بے خروش ہی

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل	زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہی
دیکھو مجھے! جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو	میری سنو! جو گوشِ نصیحت نیوش ہی

خلق ہی نہیں ہوئی ہاں دلیلِ صبح کی بو دیر ہی یعنی بجھی ہوئی شمع اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں - لطف اس مضمون کا یہ ہو کہ جس شے کو دلیلِ صبح ٹھہرایا وہ خود اک سبب ہی منجملہ اسباب تاریکی کے پس دیکھنا چاہیے کہ جس گھر میں علامت صبح موئیدِ ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا ۱۲-

[1] محفلِ خیال کو ایک میکدۂ بے خروش نے میکدہ کہہ کر اس کا نقشہ دکھلایا ہو کہ وہاں دیدار شراب ہو - حوصلہ ساقی ہو اور نگاہ مے خوار ہو - حوصلے کو ساقی اس لیے کہا کہ تصورِ معشوق کی حالت میں عاشق کو اختیار ہو کہ بقدر اپنے حوصلے کے اپنی نگاہِ شوق کو دیدار پلائے ۱۲-

[2] ہوا: - خواہش - تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل: - وہ نوجوان جنھیں خواہشاتِ نفسانی میں مبتلا ہوئے تھوڑا زمانہ گذرا ہو - زنہار: کلمۂ تاکید ہو - نائے و نوش سے - نَے کا سننا اور شراب کا پینا مراد ہو اس قطعے میں مصنف نے اپنا حال پیش کر کے نوجوانوں کو پرہیزگاری کی نصیحت کی ہو اور عیش و عشرت کی حقیقت کا نقشہ دکھایا ہو ۱۲

ساقیِ بہ جلوہ - دشمنِ ایمان و آگہی | مطرب بہ نغمہ - رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا - شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط | دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و - ذوقِ صدائے چنگ | یہ جنّتِ نگاہ - وہ فردوسِ گوش ہے

یا - صبح دم جو دیکھیے - آکر - تو بزم میں | نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی | اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں | **غالب** - صریرِ خامہ - نوائے سروش ہے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی | امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے | شوق - گل چینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی

مَے پرستاں - خُمِ مَے منہ سے لگائے ہی بنے | ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفسِ قیس - کہ ہے چشم و چراغِ صحرا | گر نہیں - شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق | نوحۂ غم ہی سہی - نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنّا - نہ صلے کی پروا | گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو | نہ ہوئی **غالب** - اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر - پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط "خراب" لکھا - بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی[1]
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

خدا کے واسطے۔ داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو۔ اے طُرّہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اِس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ!
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ۔ کہ "جو کہیے تو گلا ہوتا ہے"

پُر ہوں میں۔ شکوے سے یوں۔ راگ سے جیسے باجا
اِک ذرا چھیڑیے۔ پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو[2] سمجھتا نہیں۔ پر حُسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

---

[1] جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی: یعنی سب نشے اُتار دیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب سے دنیا کا غم ہمارے پیچھے لگ گیا ہے ہم غمِ عشق کا مزہ بھول گئے ہیں ۱۲ [2] جب ہم معشوق سے اس کے جور کا شکوہ کرتے ہیں اگرچہ

عشق کی راہ میں ہی چرخِ مکوکب[1] کی وہ چال
سست رَو۔ جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہی

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بے داد؟ کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں۔ گر تیر خطا ہوتا ہی

خوب تھا۔ پہلے سے ہوتے۔ جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہی

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا۔ اور اب
لب تک آتا ہی۔ جو ایسا ہی رسا ہوتا ہی

قطعہ

خامہ میرا۔ کہ وہ ہی باربُدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہی

ای شہنشاہِ کواکب سپہ۔ و۔ مہر علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہی

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے۔ نعل بہا ہوتا ہی

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہی ہلال
آستاں پر ترے۔ مہ ناصیہ سا ہوتا ہی

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم۔ ذوق فزا ہوتا ہی

سمجھتا نہیں مگر یہ حسن تلافی قابلِ دید ہی کہ وہ ظلم پر اور بھی آمادہ ہو جاتا ہی ۱۲۔

[1] چرخ مکوکب: یہ آسمان ستارہ دار چرخ کو مکوکب کہہ کر اس کو آبلہ پا ظاہر کیا ہی اور ستاروں کو آبلوں سے تشبیہ دی ہی ۱۲۔

رکھیو غالب۔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم۔ کہ "تو کیا ہے"
تمہیں کہو۔ کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

نہ شعلے میں یہ کرشمہ۔ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تندخو کیا ہے؟

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو۔ اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں۔ دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ۔ جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا۔ تو پھر لہو کیا ہے؟

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشک بو کیا ہے؟

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟

رہی نہ طاقتِ گفتار۔ اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے۔ کہ "آرزو کیا ہے"؟

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

میں انہیں چھیڑوں۔ اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے۔ جو مے پیے ہوتے

قہر ہو! یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے۔ تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب! کئی دیے ہوتے

آہی جاتا۔ وہ راہ پر **غالب**
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

آ۔ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنّت۔ حیاتِ دہر[1] کے بدلے
نشّہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے۔ گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشّاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اُٹھا![2] لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے عہد تو کیا ہے بارے
وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے **غالب**
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

[1] حیات دہر میں شاعر نے اُن تکلیفوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو انسان کو اس دنیا کی زندگی میں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ان سخت تکلیفوں کے بدلے جنّت کا ملنا انسان کے حق میں ایسا ہے جیسے کسی کو بیماری کی زیادہ تکلیف اُٹھانے کے بعد تھوڑی سی شراب مل جائے ۱۲

[2] لطف اُٹھا: لطف حاصل کر۔ اس شعر میں شاعر نے بہار کی ناپائداری کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتا ہے کہ دل سے جلوہ ہائے معانی کا مزہ یعنی لطفِ سخن حاصل کر (جو بے خزاں ہے) کیونکہ آئینۂ بہار میں گل کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور گل کی ناپائداری ظاہر ہے ۱۲۔

ہجومِ غم سے ۔ یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

رفو سے زخم سے ۔ مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت ۔ کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ دل کا صدائے خندۂ دل ہے

پا بہ دامن ہو رہا ہوں ۔ بس کہ میں صحرا نورد
خارِ پا ۔ ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

دیکھنا حالت مرے دل کی ۔ ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا ۔ تیرا سرِ ہر مو مجھے

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار[1] میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

[1] گفتار میں آوے : یہ فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے ۔ اردو میں نہیں بولتے ۔ اس کے معنی ہیں بات چیت کرے ۱۲ ۔

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو۔ اُس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر!
کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی۔ پیاس سے یارب
اِک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زُنّار میں آوے

غارت گرِ ناموس۔ نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے۔ دلِ نالاں
جب۔ اِک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتش کدہ ہے سینہ مرا۔ رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ۔ **غالب**۔ مرے اشعار میں آوے

حُسنِ مہ۔ گرچہ بہ ہنگامِ کمال۔ اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں۔ اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ "مفت آئے تو مال اچھا ہے"

اور بازار سے لے آئے۔ اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں۔ تو مزا اُس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال۔ اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے۔ پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض؟
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال۔ اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

[1] خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

[2] ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت۔ لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ۔ یہ خیال اچھا ہے

[3] غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ؟ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے۔ گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے۔ اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا؟ مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن [4] پھریں حمام کے؟

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

[1] خضر سُلطان شاہ ابو ظفر کے شہزادے کا نام ہے ان کے لیے شاعر نے اس شعر میں دعا دی ہے ۱۲
[2] شاعر نے اپنے فلسفیانہ عقیدے کے مطابق دوزخ اور جنت کے وجود کو خارجی سمجھا ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ جنت کا اعتقاد رکھنا اطمینان قلب کے لیے ضروری ہے ۱۲
[3] محفل سے معشوق کی محفل عیش مراد ہے اور پیغام سے پیغام طلب ۱۲
[4] دن پھرنا: تقدیر کا موافق ہونا ۱۲

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوے مہر و مہ تماشائی

ق

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر
رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے[1] ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی **غالب**
شاہِ دیں دار نے شفا پائی

تغافل[2] دوست ہوں - میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے - تو جا میری بھی خالی ہے

رہا آباد عالم - اہلِ ہمت[3] کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو - مے خانہ خالی ہے

[1] بہار کی وجہ سے جب ہوا میں شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے تو شراب پینا فضول ہے ہوا کھانے ہی سے شراب کا لطف ملتا ہے ۱۲ [2] تغافل کو دوست رکھتا ہوں یعنی میرا عجز و انکسار اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ مجھے بے توجہی ہی پسند ہے اگر آپ مجھ سے پہلو تہی یا بے التفاتی کریں گے تو گویا میرے لیے جگہ خالی کریں گے کیونکہ اغماض کو میں التفات سمجھتا ہوں [3] اہل ہمت مراد اہلِ دل اور اہل اللہ سے ہے بالکل نیا مضمون ہے شاعر کہتا ہے کہ صرف

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ[۱] غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری

کیا[۲] بیاں کر کے مرا روئیں گے یار؟
مگر آشفتہ بیانی میری

ہوں[۳] ز خود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل[۴] ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرد[۵] بادِ رہِ بیتابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

دہن[۶] اُس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے اس دنیا کی چہل پہل باقی ہے۔ کیونکہ اہل ہمت دنیا کو فانی سمجھ کر اس کی جانب عدم توجہی کرتے اور وہ دنیا برباد ہو جاتی۔ دوسرے مصرعے میں اسی مضمون کو مثال سے سمجھایا گیا ہے ۱۲

۱ اُس کے غمزے کی خوں ریزی نے جو خلش دل میں پیدا کر دی ہے اس کا اندازہ میرے خوں کے آنسوؤں سے بخوبی ہوتا ہے ۱۲

۲ اس شعر میں کیا کے بعد وصف کا لفظ محذوف ہے اور یہ حذف نہایت پر لطف ہے ۱۲

۳ بیدا۔ بالفتح بمعنی بیاباں و دشت۔ بیدائے خیال: صحرائے خیال۔ میں صحرائے خیال کا از خود رفتہ ہوں یعنی دوستوں کے خیال سے نکل جاتا ہوں اور احباب کے خیال سے فراموش ہو جانا ہی میری پہچان ہے ۱۲

۴ اس شعر کے معنی مصنف نے خود اپنی زندگی میں مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر اپنے ایک شاگرد کو ایک خط میں لکھ کر بھیجے تھے جو اُنھیں کے الفاظ میں یہ ہیں: "تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت۔ شادی و غم۔ راحت و رنج۔ وجود و عدم۔ لفظ متقابل اس مصرعے میں بمعنی مرجع ہے جیسے حریف کہ بمعنی دوست کے بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور دوست از روئے خو و عادت ضد ہمدگر ہیں وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا ۱۲ عود ہندی ۵ گرد باد: بگولا ۱۲۔

۶ دہن معشوق کو شاعر ہیچ جانتے ہیں اور مصنف بھی بحیثیت شاعر ہونے کے ہیچ جاننے والوں کے

کردیا ضعف نے عاجز غالب
ننگِ پیری ہے جوانی میری

نقشِ نازِ بتِ طنّاز۔ بہ آغوشِ رقیب[1]
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
تو وہ بدخو کہ تحیر کو۔ تماشا جانے
غم وہ افسانہ۔ کہ آشفتہ بیانی مانگے
وہ تپ عشقِ تمنا ہے۔ کہ پھر صورت شمع
شعلہ۔ تا نبضِ جگر۔ ریشہ دوانی مانگے

گلشن کو تری صحبت۔ از بس کہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گل ہونا۔ آغوش کشائی ہے
واں کنگرِ استغنا۔ ہر دم ہے بلندی پر۔
یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

زمرے میں ہے اس لیے اپنے کو ہیچ مداں کہا ۱۲

[1] شاعر کو اس شعر میں رقیب کی ہجو کرنا منظور ہے وہ کہتا ہے کہ رقیب ایسا بد صورت ہے کہ جب معشوق کی تصویر اس کی ہم آغوشی کی حالت میں کھینچی جائے تو وہ بھی باوجود معشوق کے حسین ہونے کے بدنما معلوم ہوتی ہے اور ہوئے قلم کی جگہ مصور کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ میں پائے طاؤس کا قلم ہو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ طاؤس کے سب اعضا حسین ہوتے ہیں لیکن اس کے پاؤں بہت بدصورت ہوتے ہیں ۱۲۔

[1] ازبس کہ سکھاتا ہی غم۔ ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا اِک چشم نمائی ہی

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
اچھا ہی[2] سرِ انگشتِ حنائی کا تصور
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو

لکھ دیجیو یارب! اُسے قسمت میں عدد کی
دل میں نظر آتی تو ہی۔ اک بوند لہو کی
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف! وہ ناکام۔ کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بُتِ عربدہ جو کی

[3] سیمابِ پشت گرمیِ آئینہ دے ہی۔ ہم
حیراں کیے ہوے ہیں دلِ بے قرار کے
آغوشِ گُل۔ کشودہ برائے وداع ہی
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

[1] غمِ عشق ضبط کی تعلیم کر رہا ہی۔ دل میں جو نیا داغ نظر آتا ہی وہ استاد یعنی غمِ عشق کی طرف سے چشم نمائی ہوتی ہی۔ داغ کو آنکھ سے نسبت دینے کی وجہ ظاہر ہی ۱۲

[2] سرِ انگشت:۔ انگلی کے پور۔ اس شعر میں شاعر نے معشوق کی انگشت حنائی کی خوبصورتی اور نزاکت اس کے پوروں کو لہو کی بوندوں سے مشابہت دے کر ثابت کی ہی عجیب و غریب تشبیہ ہی ۱۲ — [3] پشت گرمی:۔

ہو وصل-ہجر-عالمِ تمکین وضبط ہیں
اُس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں

معشوقِ شوخ وعاشقِ دیوانہ چاہیے
شوقِ فضول وجراتِ رندانہ چاہیے

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں-تو پھر کیا چاہیئے؟

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مَے اپنے کو کھینچا چاہیئے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیئے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

دشمنی نے میری-کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے؟ دیکھا چاہیئے

اپنی-رسوائی میں-کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

غافل-ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو-اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

بہ معنی پشت بانی واعانت یعنی جس طرح پارے کی تلملی نے شیشے کو آبلہ پا بنا دیا ہے-اسی طرح ہمارے دل بے قراری نے ہماری حیرانی کو پیدا کر دیا ہے اس شعر میں شاعر نے اپنے دل بے قرار کو سیماب سے اور اپنی حیرانی کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے ۱۲-

له غالب نے اس شعر میں کھینچنا دو معنی میں لکھا ہے ایک تو کھینچنا جو کشیدن کا ترجمہ ہے بہ معنی شراب پینا اس معنی میں کھینچنا استعمال کرنا غالب کے لیے مخصوص تھا-اردو میں عموماً ایسا نہیں بولا جاتا-دوسرے معنی احتراز کرنا ۱۲ له اُدھر کا اشارہ: رقیب کے اشارے سے مطلب ہے ۱۲-

[۱] ہر قدم دورئ منزل ہی نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہی بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا۔ بہ تغافل۔ خوش تر
ہی نگہ۔ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ۔ گریزاں مجھ سے

[۲] غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہی ویراں مجھ سے

[۳] اثرِ آبلہ سے۔ جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہی چراغاں مجھ سے

---

[۱] اس شعر میں شاعر نے اپنی ناکامی کا بیان بہ غلو کیا ہی وہ کہتا ہی کہ میں جس قدر چلتا ہوں اُسی قدر منزل دور ہوتی جاتی ہی۔ دوسرے مصرع میں منزل کے دور ہوتے جانے کا سبب یہ بیان کیا ہی کہ میری رفتار ایسی مجنونانہ ہی کہ بیابان اس سے ڈر کر آگے کو بھاگتا ہی ۱۲

[۲] پہلے مصرعہ میں عموماً حسینوں سے شاعر نے ہمدردی کا اظہار کرکے یہ خواہش کی ہی کہ خدا نہ کرے کہ وہ غمِ عشاق میں سوگوار ہو کر بناؤ سنگھار ترک کر دیں دوسرے مصرعہ میں اس واقعہ کا بیان ہی جس سے متاثر ہو کر اس کے دل میں یہ جذبہ ہمدردی پیدا ہوا ہی ۱۲

[۳] مطلب یہ ہی کہ پاؤں کے آبلے کے اثر سے یعنی آبلوں سے جو لہو ٹپکا ہی اُس سے جادۂ صحرا رشتۂ گوہر کی طرح چراغاں ہو گیا۔ جادہ کو رشتہ سے تشبیہ دی ہی ۱۲

ے بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو

پُر ہے ۔ سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے

ہو نگہ مثلِ گلِ شمع ۔ پریشاں مجھ سے

بے کسی ہائے شبِ ہجر کی حسرت ہے ہے

سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے

آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے ۔ اسد

ہے چراغاں ۔ خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

نکتہ چیں ہے ۔ غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات ۔ جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُس کو ۔ مگر اے جذبۂ دل

اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لہ ہو جو :۔ ہو جو کا مخفف ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح شبستان تاریکی سے معمور ہے ۔ ہونا ہوا اسی طرح میرا
شبستان میرے وجود سے پر ہے ۔ اب یہ خواہش ہے کہ اس سے بے خودی تمہیدِ فراغت کا بستر ہے ۔ یعنی میں عالمِ بے ہوشی
میں تمام سے بڑا ہوں ۔ فراغت کے لغوی معنی خالی ہونے کے ہیں اصطلاح میں راحت مراد ہے ۔ نقطۂ فراغت کی بحث
ظاہر ہے ۱۲ ۔ جلوۂ رنگیں سے جلوۂ حسن اور دیدۂ حیراں سے حیرتِ عشق کی طرف اشارہ ہے ۱۲ ۔ بات کا بننا ، تدبیر کا پورا
بات کا بنانا : بات کو توڑ مروڑ کر اپنے حسبِ مطلب الفاظ میں کہنا ۱۲ ۔ کسی پر بن جانا : مصیبت میں مبتلا ہو جانا ۱۲

کھیل سمجھا ہی۔ کہیں چھوڑ نہ دے۔ بھول نہ جا
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہی۔ لیے یوں۔ ترے خط کو کہ۔ اگر
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہی؟" تو چھپائے نہ بنے

اِس نزاکت کا بُرا ہو۔ وہ بھلے ہیں۔ تو کیا
ہاتھ آئیں۔ تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون۔ کہ یہ جلوہ گری کس کی ہی؟
پردہ چھوڑا ہی وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہی کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہی کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں۔ ہی یہ وہ آتش **غالب**
کہ لگائے نہ لگے۔ اور بجھائے نہ بنے

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کے مانند زخمِ دل۔ گریبانی کرے

ــه تہ حرکت ہے کہ موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کیونکہ اس کا آنا لازمی ہے۔ تم کو کیوں چاہوں کیوں کہ اگر تم نہ آؤ میں بلانے کی بھی جرات نہیں کرسکتا۔ مصنف نے اس شعر میں عشق معشوق پر موت کو ترجیح دی ہے۔ عه عریانی کی حالت میں اگر وحشت کو

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو۔ زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید۔ یارب کب تلک
آب گینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ۔ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض کو لکھا ہے۔ زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

چاک گریباں کی آرزو پیدا ہے تو میرا زخمِ دل صبح کی مثل چاک ہو کر گریبان بن جائے گا یعنی حالت عریانی کی وجہ سے جب چاک کرنے کو تن پر کپڑا نہ ہوگا تو اسی طور پر یہ خواہش دوسرے طریقہ سے پوری کرنی پڑے گی ۱۲۔

آب گینہ: شیشۂ دل سے مراد ہے۔ کوہ استعارہ ہے معشوق کی سنگدلی کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کب تک یہ خواہش کریں کہ معشوق سنگ دل ہمارے دل کو توڑ دیے ہیں اس سے ناامیدی ہے کہ وہ ہماری دل شکنی ہی پر متوجہ ہوگا ۱۲۔

موئے شیشہ: شیشے میں جو بال پڑ جاتے ہیں۔ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے۔ دیدۂ ساغر کی پلکیں بن جائیں ۱۲

عارضِ یار پر جو خط نکلا ہے وہ ایک عہدنامہ ہے جو الفت نے زلف کے نام لکھا ہوا جس کا مضمون یہ ہے کہ میرے حق میں جو کچھ پریشانی کرنا ہو کرے مجھے سب منظور و قبول ہے ۱۲۔

تسکین اضطراب تو دے۔ یعنی اضطراب میں اس کو تسکین دینا ممکن ہے۔ مجال خواب تو دے یعنی خواب کا آنا بڑی بات ہے ۱۲۔

کرے ہی قتل - لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی - تمام کر ہم کو[1]
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی - جو ہم سے نفرت ہی
پیالہ گر نہیں دیتا - نہ دے - شراب تو دے

اسد - خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے "ذرا میرے پانوں داب تو دے"

تپش سے میری - وقفِ کشمکش - ہر تارِ بستر ہی
مرا سر رنجِ بالیں ہی - مرا تن بارِ بستر ہی

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ - نور العینِ دامن ہی[2]
دلِ بے دست و پا افتادہ - برخوردارِ بستر ہی

خوشا اقبالِ رنجوری - عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں - طالعِ بیدارِ بستر ہی

---

[1] کہیں جواب تو دے - کسی نہ کسی طرح جواب تو دے ۱۲ -

[2] اس شعر میں شاعر نے اپنی ناکامی اور ناچاری کا بیان کیا ہی کہ اس کا آنسو دامن کا نور العین اور اس کا دلِ مجبور بسترِ مرض کا برخوردار ہی یعنی آنسو کو دامن سے اور دل کو بستر پر پڑے رہنے سے محبت ہو گئی ہی

۱؎ یہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر۔ تارِ بستر ہے

۲؎ ابھی آتی ہے بُو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی

ہماری دید کو۔ خوابِ زلیخا۔ عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے۔ ہجرِ یار میں **غالب**

کہ بے تابی سے۔ ہر اک تارِ بستر۔ خارِ بستر ہے

۳؎ خطر ہے رشتۂ اُلفت۔ رگِ گردن نہ ہو جائے

غرورِ دوستی۔ آفت ہے۔ تو دشمن نہ ہو جائے

۴؎ سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما **غالب**

اگر گُل۔ سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے	نالہ۔ پابندِ نَے نہیں ہے

۱؎ مطلب یہ ہے کہ شامِ تنہائی میں ایسا اضطراب اور تاریکی ہے کہ گویا ہر ایک تارِ بستر آفتاب روزِ حشر کی کرن بن گیا ہے۔

۲؎ شاعر کہتا ہے کہ ابھی ہمارے تکیوں سے معشوق کے زلفِ مشکیں کی خوشبو گئی نہیں ہے یعنی ابھی ہمیں وصل کا لطف فراموش نہیں ہوا ہے ایسی حالت میں زلیخا کی طرح صرف خواب میں دیدارِ یار کا حاصل ہو جانا ہمارے بستر کے لیے ننگ ہے۔

۳؎ خطرہ ہے بیاں "یہ" محذوف ہے۔ رگِ گردن: غرور کی طرف اشارہ ہے غرور سے اور غیظ و غضب سے رگِ گردن پھول جاتی ہے۔ ۴؎ پہلا مصرعہ صاف ہے۔ دوسرے مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ بہار میں شاخ اسے گل کو اس قدر نمو نہ ہو

[۱]کیوں ہوتے ہیں باغبان تو نبے؟ — گر باغ گدائے مَے نہیں ہے

[۲]ہرچند۔ ہر ایک شے میں تو ہے — پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں۔ کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں۔ کہ۔ "ہے" نہیں ہے

[۳]شادی سے گزر۔ کہ غم نہ ہووے — اُردی جو نہ ہو تو دی نہیں ہے

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد؟ — مَے ہے۔ یہ مگس کی قے نہیں ہے

[۴]ہستی ہے۔ نہ کچھ عدم ہے۔ **غالب**

آخر تو کیا ہے؟ **اے "نہیں ہے"**

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دِل کا

کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

کہ وہ سرد کی قبا بن جائیں ۱۲۔

[۱] تونبوں سے کشکول اور کدو سے شراب پیتے ہیں اس لیے اس کی موجودگی سے باغ کو شراب کا بھکاری ثابت کیا ہے ۱۲۔

[۲] تجھ سی:۔ تیری مثل۔ اس شعر میں خدا کی طرف اشارہ ہے ۱۲۔

[۳] اُردی:۔ ماہ بہار۔ دی:۔ ماہ خزاں (فارسی مہینوں کے نام ہیں) یعنی اپنے کو لطف بہار کا عادی نہ بنا تاکہ پھر خزاں کا غم سہنا نہ ہو مطلب یہ ہے کہ انسان کو اگر دنیا میں کسی شے سے دل بستگی نہ ہو تو کسی چیز کے ترک کا غم بھی نہ ہوگا

[۴] چونکہ مصنف نے اس شعر کی ردیف "نہیں ہے" قرار دی ہے اور اس لیے ہر شعر میں بار بار مخاطب کو "نہیں ہے" "نہیں ہے" سننا پڑا ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب ایک ہی لفظ کو مخاطب سنتے سنتے اکتا جاتا ہے تو وہ بے اختیارانہ انہیں الفاظ قائل کو خطاب کرنے لگتا ہے جس سے اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اب ان الفاظ کا اعادہ موقوف کیجیے۔ اسی طرح غالب نے ازراہ شوخی اپنا نام "نہیں ہے" قرار دے کر اپنے سے خطاب کیا ہے کہ اے جناب "نہیں ہے"! جب نہ ہستی ہے نہ عدم

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اِک نگہ۔ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں۔ ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے
در پردہ اُنھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
[لہ] یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالب کو بُرا کہتے ہو۔ اچھا نہیں کرتے

[عہ] گرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گل چیں ہے
کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
بجا ہے۔ گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل۔ نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

تو پھر یہ تو بتا دے کہ یہ کیا چیز ہے؟
[لہ] اربابِ ہوس: رقیبوں کی طرف اشارہ ہے۔
[عہ] شراب کو گل چیں۔ لبِ معشوق کو پھول۔ خطِ ساغر کو نگاہِ گل چیں سے نسبت دی گئی ہے۔

اسدؔ ہی نزع میں چل بے وفا! برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

کیوں نہ ہو؟ چشمِ بتاں محوِ تغافل۔ کیوں نہ ہو؟
یعنی اُس بیمار کو نظّارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے۔ دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

دیا ہے دل اگر اُس کو۔ بشر ہے۔ کیا کہیے؟
ہوا رقیب تو ہو۔ نامہ بر ہے۔ کیا کہیے؟
یہ ضد کہ آج نہ آئے۔ اور آئے بِن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے؟ کیا کہیے؟
رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ "دشمن کا گھر ہے" کیا کہیے؟

دیکھ ۔۔ دیکھ کر ۱۲۔

"دیا ہے دل" ۔۔ اس کا فاعل نامہ بر ہے۔ اس کو محبوب کو ۱۲۔

زہی کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہو ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی اُنھیں سب خبر ہو۔ کیا کہیے؟
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ "سرِ رہ گزر ہو۔ کیا کہیے"؟
ل؎ تمھیں نہیں ہو سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہو، مگر ہو۔ کیا کہیے!
اُنھیں سوال پہ زُعمِ جنوں ہو کیوں لڑیے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہو۔ کیا کہیے؟
حسد۔ سزائے کمالِ سخن ہو۔ کیا کیجے؟
ستم۔ بہائے متاعِ ہنر ہو۔ کیا کہیے؟
کہا ہو کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہو کیا کہیے؟

۲؎ دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عُریانی مجھے

ل؎ گرہ ہی کیا جو کیا چیز ہو۔ سر رشتۂ وفا کو شاعر ایک محسوس شے فرض کر کے کہتا ہو۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ ہو۔ یعنی سر رشتۂ وفا ہو۔ اس شعر میں یہ شوخی ہو کہ شاعر پوچھتا بھی ہو کہ ہماری مٹھی میں کیا چیز ہو اور پھر معنوں معنوں میں اُس چیز کا نام بھی لے دیا ہو۔

۲؎ دامن افشانی: ترکِ تعلقاتِ دنیوی۔ مطلب یہ ہو کہ تعلقات دنیا سے چھٹکارا ممکن ہی نہیں۔ اگر انسان عُریانی

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں[1]

مرحبا میں! کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے!

کیوں نہ ہو بے التفاتی؟ اُس کی خاطر جمع ہے[2]

جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی[3]

لکھ دیا۔ من جملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے

اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا

لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے

تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

یعنی رقیب تو جسمانی پابندی باقی رہتی ہے۔

[1] سنگِ فساں:۔ وہ پتھر جس پر تلوار وغیرہ کو گھس کر دھار رکھتے ہیں۔

[2] پرسش ہائے پنہانی سے سوا اس مطلب کے جو طباطبائی نے اپنی شرح میں لکھا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ پرسش ہائے پنہانی سے مطلب مصنف کا یہ ہے کہ کبھی تصور میں آ کر اور کبھی خواب میں آ کر جو وہ صورت دکھا جاتا ہے یہ اُس کی بے التفاتی سے جو حالت میری ہو رہی ہے میں اسی میں محو ہوں، اور اسی سبب اس کی خاطر جمع ہے جو التفات نہیں کرتا ہے۔

[3] جب ازل میں میرے گھر کی قسمت کا حال لکھا جا رہا تھا اس وقت تقدیر نے خود مجھی کو میرے گھر کی ویرانی کا سبب قرار دیا تھا۔ گویا میرے گھر کی ویرانی میرے وجود سے ہے۔

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ! واہ!!

پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے ازسرِ نو زندگی

میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

یادہےلہ شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے

سُبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہے کُشادِ خاطرِ وابستہ - درستہ رہنِ سخن

تھا طلسمِ قفلِ ابجد۔ خانۂ مکتب مجھے

یارب!ستہ اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے؟

رشک، آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

لہ ہنگامۂ یارب سے مراد ہنگامۂ فریاد ہے کیونکہ "یارب" کے معنی فارسی محاورے میں خدا کی دہائی دینے کے ہیں۔ دانہ ہائے تسبیح ، جو صورتِ خندہ نمایاں ہوتے ہیں زیرِ خندہ زیرِ لب سے تشبیہ دی ہے مطلب یہ ہے کہ شادی میں بھی مجھے یارب یارب کا نالہ بھولا نہیں ہے اس سے مجھے زاہد کا چپکے چپکے تسبیح پر یارب یارب پڑھنا ہنسی کی بات معلوم ہوتا ہے۔

ستہ اس شعر میں لفظ "در" نے فارسیت کا رنگ غالب کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے میرے دلِ بستہ کی کشائش سخن کی قید میں ہے یعنی میرا دل ہمیشہ وابستہ رہتا ہے اور اگر شگفتگی ہوتی ہے تو سخن سے جس طرح قفل ابجد کے کھلنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اُس کی کڑیاں جن پر مختلف حروف کندہ ہوتے ہیں گھما کر اس وضع پر کر دی جائیں کہ وہ حروف بترتیبِ حروفِ ابجد ہو جائیں۔ اسی طرح ازل سے میرے دل کو یہ تعلیم ملی ہے کہ لطفِ سخن سے اُس کی وابستگی دور ہو جائے۔

ستہ کس سے چاہیے: کس سے مانگیے۔ "اب مجھے" سے شاعر نے یہ معنے پیدا کیے ہیں کہ جب زنداں میں تھا اُس وقت صحرا نوردی کا شوق تھا اب صحرا میں زنداں یاد آتا ہے اور اہلِ زنداں پر رشک آتا ہے۔

طبع[1] ہی مشتاقِ لذت ہائے حسرت۔ کیا کروں؟
آرزو سے ہی شکستِ آرزو مطلب مجھے
دل لگا کر آپ[2] بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہی
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہی
قد و گیسو میں۔ قیس و کوہکن[3] کی آزمائش ہی
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہی
کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہی

---

[1] میری طبیعت کو حسرت و یاس کی لذت کا مزا پڑا ہی۔ اس لیے آرزو کرنے سے میری یہ غرض ہوتی ہی کہ وہ پوری نہ ہو کیونکہ آرزو کے قطع ہو جانے سے لذت حسرت حاصل ہوتی ہی ۱۲

[2] آپ بھی: خود بھی۔ میرزا صاحب سے غالب مراد ہی۔ اس شعر میں دوسرے کی زبان سے مضمون شعر ادا کیا ہی ۱۲

[3] شیریں و فرہاد کے مشہور قصے کی طرف اشارہ ہی۔ مطلب یہ ہی کہ ابھی تو اس کی طاقت جسمانی کا امتحان ہی کہ دیکھیں پہاڑ کاٹ کر جوے شیر نکال سکتا ہی یا نہیں اس کے بعد وہ وقت بھی آنے والا ہی جبکہ ایک بڑھیا شیریں کے مر جانے کی خبر سنائے گی وہ گویا اس کے حوصلے کے امتحان کا وقت ہوگا اور وہ ایسا کم حوصلہ نکلے گا کہ سر پھوڑ کر جان دیدیگا"

[۱] نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی؟
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

[۲] وہ آیا بزم میں، دیکھو! نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر، اچھا - جگر کے پار ہو، بہتر
غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سُبحہ و زنّار کے پھندے میں، گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ - اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زُلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو؟
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

[۳] وہ آئیں گے مرے گھر؟ وعدہ کیسا؟ دیکھنا **غالب**
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

[۱] پیرِ کنعاں - حضرت یعقوب سے مراد ہے - اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت یعقوب نے کوسوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بوئے پیراہن کو تمیز کر لیا تھا ۱۲

[۲] وہ آیا - معشوق کی طرف اشارہ ہے - دیکھو، ہوشیار ہو جاؤ

[۳] استفہام انکاری ہے وہ ہرگز نہ آئیں گے نہ انھیں وعدے کا کچھ خیال ہے - اب دیکھیے ان کے نہ آنے سے چرخِ فتنہ پرداز ہم پر کیا نئی مصیبت نازل کرتا ہے ۱۲

ؔلہ کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہی مجھ سے

جفائیں کرکے اپنی یاد۔ شرما جائے ہی مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی۔ مگر تاثیر اُلٹی ہی

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہی مجھ سےؔ[۲]

ؔ[۳] وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق طولانی

عبارت مختصر۔ قاصد بھی گھبرا جائے ہی مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہی۔ اِدھر یہ ناتوانی ہی

نہ پوچھا جائے ہی اُس سے نہ بولا جائے ہی مجھ سے

ؔ[۴] سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہی؟

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہی مجھ سے

ؔ[۵] تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن

وہ دیکھا جائے۔ کب یہ ظلم دیکھا جائے ہی مجھ سے؟

لہ مطلب یہ ہی کہ اگر اُس کو مجھ پر کبھی رحم بھی آجاتا ہی یعنی اگر کبھی مجھے وصل بھی میسر آجاتا ہی وہ بھی میرے لیے مشکل سے خالی نہیں کیوں کہ اس وقت بھی وہ اپنی گزشتہ جفاؤں کو یاد کرکے شرما جاتا ہی اور اس کی یہ شرم لطفِ وصل میں خلل انداز ہوتی ہی ۱۲

[۲] کھنچا جائے ہی مجھ سے :۔ مجھ سے آزردہ ہوتا جاتا ہی ۱۲

[۳] عبارت مختصر :۔ قصہ مختصر۔ الغرض مطلب یہ کہ جب قاصد میری طول داستان سے گھبرا جاتا ہی تو وہ (معشوق) جو کہ بدخو ہی کب سنا گوارا کریگا ۱۲

[۴] شاعر کہتا ہی کہ غلبۂ یاس میں مطلب ہاتھ سے جاتا رہتا ہی ۱۲

[۵] نظارگی :۔ دیکھنے والا۔ وہ دیکھا جائے۔ یعنی اغیار اس کا نظارہ کریں۔ کب یہ ظلم دیکھا جائے ہی مجھ سے :۔ مجھ سے

ہوے ہیں پانوں ہی پہلے۔ نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جاے ہی مجھ سے۔ نہ ٹھہرا جاے ہی مجھ سے
قیامت ہی کہ ہووے مدعی کا ہم سفر **غالب**
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جاے ہی مجھ سے

زہی کہ مشقِ تماشا۔ جنوںؔ[۱] علامت ہی
کشاد و بستِ مژہ۔ سیلیِ ندامت ہی
[۲] نہ جانوں۔ کیوں کہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی؟
تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہی
بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز۔ سرِ رشتۂ سلامت ہی
[۳] وفا مقابل و دعواے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گُل قیامت ہی

ظلم کب گوارا ہو سکتا ہی۔؎
[۱] جنوں علامت:۔ جنون کی علامت والا۔ کشاد و بستِ مژہ:۔ پلکوں کا کھلنا اور بند ہونا۔ سیلیِ ندامت:۔ ندامت کی طرف سے سزا کا تھپڑ۔؎
[۲] تو لاکھ آرایش و زیبایش کرے لیکن تیرا داغ بدعہدی مٹنے والا نہیں ہی یعنی تو جب رقیب کی خاطر سے بناؤ سنگار کر کے آئینہ دیکھتا ہی تو وہ بھی تیرے بے دھبۂ ملامت بن جاتا ہی یعنی ہم سے بدعہدی کر کے رقیب کے پاس جانے کی تیاری پر تجھے ملامت کرتا ہی۔؎
[۳] اس شعر میں رقیب کے جھوٹے عشق کا ذکر بہ طور طعن کیا گیا ہی کہتا ہی کہ یہ بڑا غضب ہی کہ معشوق آمادہ وفا ہو اور عشق کا

لاغر اتنا ہوں کہ گر۔ تو بزم میں۔ جا۔ دے مجھے
میرا ذمہ۔ دیکھ کر۔ گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہی؟ کہ اُس کو دیکھکر آ جاے رحم
واں تلک۔ کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

ملہ منہ نہ دکھلاوے نہ دِکھلا۔ پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ۔ ذرا آنکھیں ہی دِکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہی کہ میں
زُلف گر بن جاؤں۔ تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

بازیچۂ اطفال ہی دنیا۔ مرے آگے
ہوتا ہی شب و روز تماشا مرے آگے

اِک کھیل ہی اورنگِ سُلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہی اعجازِ مسیحا مرے آگے

جُز نام۔ نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم۔ نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

دعویٰ جھوٹا ہو یہ تو وہی معاملہ ہو کہ فصلِ بہار تو واقعی آئی ہو اور جنون نہ آتی ہو ۱۲

ملہ آنکھ دکھانا = خفا ہونا ۱۲ -

ہوتا ہی نہاں گرد میں صحرا۔ مرے ہوتے[1]
گھستا ہی جبیں۔ خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہی میرا ترے پیچھے[2]
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہی تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو۔ خود بین و خود آرا ہوں۔ نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہی بُتِ آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیئے اندازِ گُل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

نفرت کا گُماں گزرے ہی۔ میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں "لو نام نہ اُن کا مرے آگے"

ایماں مجھے روکے ہی جو کھینچے ہی مجھے کفر[3]
کعبہ مرے پیچھے ہی۔ کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں۔ پہ معشوق فریبی ہی مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہی لیلا مرے آگے

---

[1] مرے ہوتے:۔ مجھ صحرا گرد کے ہوتے، مرے آگے:۔ مجھ اشکبار کے مقابل میں۔ صحرا کا ذکر کرکے اپنی صحرا نوردی کی غایت اور دریا کا حال لکھ کر اپنی اشکباری کی شدت دکھائی ہی۔

[2] فراق میں جو میری حالت ہوتی ہی اس کے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اپنی اُس حالت کو دیکھ کر جو وصل میں پیدا ہوتی ہی تو میری حالتِ فراق کو قیاس کرلے۔ یعنی جس طرح تو وصل میں حیا و شوخی کی کشمکش کے سبب پریشان سا نظر آتا ہی۔ ایسے ہی میری بھی ہجر میں دل تنگ اور پریشان رہتا ہوں۔

[3] کعبہ میرے پیچھے ہی:۔ کعبہ میرے پیچھے پڑ رہا ہی۔ یعنی اصرار کر رہا ہی۔ کلیسا

خوش ہوتے ہیں - پر - وصل میں یوں نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے

ہے موجزن اِک قلزمِ خوں - کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں - آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو - ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو - اچھّا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے"
تمہیں کہو - کہ جو تم یوں کہو - تو کیا کہیے؟
نہ کہیو طعن سے پھر تم - کہ "ہم ستمگر ہیں"
مجھے تو خو ہے - کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے
وہ نیشتر سہی - پر دل میں جب اُتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟

ا سے یاد رہا ہو کہ ادھر آ؟ ۱۲
مرے آگے آ گئی بہ بڑا بول میرے سامنے آیا یہ شعر ساری غزل کی جان ہے ۱۲
خون کے آنسوؤں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے ۱۲

نہیں ذریعۂ راحت - جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے - جس کو کہ دل کشا کہیے
جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنیے
جو نا سزا کہے - اُس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں حقیقتِ جاں کاہیٔ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیٔ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان - تو قاتل کو خوں بہا[1] دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو اُلفت - نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روشِ[2] و مستیٔ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت[3] نہ ہو - بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

[1] خوں بہا دیجیے - مراد خوں بہا بخش دینے سے ہے ۱۲
[2] روش :- رفتار ۱۲
[3] فرصت :- قرار و استقلال ۱۲

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب![1]
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے؟

روتے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے[2]
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہوگئے

صرفِ بہائے مَے ہوئے آلاتِ مَے کشی
تھے یہ ہی دو حساب۔ سو یوں پاک ہوگئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہوگئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟
پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہوگئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم۔ اہلِ شوق کا؟
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہوگئے

[1] شاعر کہتا ہے ناخدا نے بہت چاہا کہ ہماری کشتی ڈوب جائے۔ لیکن خدا کا حکم ایسا نہ تھا اور باوجود ناخدا کی کوشش کے جبکہ ہماری کشتی کنارے آلگی ہے تو اب خدا سے اس کی شکایت فضول ہے مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہمیں نقصان پہونچانے کی کوشش کرے اور اس کو کامیابی نہ ہو تو اس وقت کو بھول جانا چاہیے اور اس کی شکایت نہ کرنی چاہیے۔

[2] اور یہاں بمعنی زیادتی استعمال ہوا ہے۔ دھوئے گئے: شرم و حجاب سب دھو گیا پاک ہوگئے: پاک شہد بن گئے پاک شہدے محاورہ ہے یعنی خالص شہدے۔ قاعدہ ہے کہ جب تک انسان عشق و محبت کو چھپاتا ہے ہر ایک بات کا لحاظ رہتا ہے لیکن جب راز کھل جاتا ہے تو پھر اس کو کسی سے شرم باقی نہیں رہتی ہے [3] شراب کی

کرنے گئے تھے۔ اُس سے۔ تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ۔ کہ بس خاک ہو گئے
اس رنگ سے اٹھائی کل اُس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

نشّہ[۱] ہا شادابِ رنگ۔ و ساز ہا مستِ طرب
شیشہ ی۔ سروِ سبزِ جوے بارِ نغمہ ہی
ہم نشیں مت کہہ۔ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست"
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہی

عرضِ[۲] نازِ شوخیِ دنداں۔ برائے خندہ ہی
دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہی

قیمت کی بہم رسانی اور آلات مے کشی کی حفاظت بھی دو حساب سے تھے یعنی دو فکریں تھیں سو ان سے یوں چھٹکارا ہوا کہ آلات مے کشی کو بیچ کر شراب پی لی۔

[۱] اس شعر میں شاعر نے معشوق کی بزم عیش کا سماں دکھلایا ہی وہ کہتا ہی حالت سرور میں نشّے رنگ سے شاداب ہیں اور باجے جو بج رہے ہیں وہ نشۂ طرب سے سرشار ہیں اور شیشۂ مے جوئبار نغمہ کا ایک سرسبز سرو ہی نغمے کو بہ اعتبار روانی آواز جوئے بار کہا گیا ہی یہ تشبیہ نئی اور پرلطف ہی اور شیشۂ مے کو بہ اعتبار سبزی اُس جوئے بار کا سرو سبز ٹھہرایا ہی ۱۲۔

[۲] دانت کو جو بہ جمعیت مجموعی اپنی شوخی (خوبی) پر ناز ہی تو اس کا اظہار صرف ہنسی ہی کے موقع پر ہوتا ہی۔ بس دوستوں کے ایک جا ہونے کا دعویٰ بھی ہنسی کے قابل ہی کیونکہ جس طرح یکجا رہتے ہیں دانت

ہی[1] عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گُل
یک جہاں زانو۔ تامّل۔ در قفائے خندہ ہی

کلفتِ[2] افسردگی کو۔ عیشِ بے تابی حرام
ورنہ۔ دنداں در دل افشردن۔ بنائے خندہ ہی

سوزشِ[3] باطن کے ہیں احباب مُنکر۔ ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ وُ لب آشنائے خندہ ہی

ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اسی طرح یاران صحبت میں بھی جدائی ہو جاتی ہی ۱۲

[1] "ہی عدم میں غنچہ" یعنی کھلنے کے بعد غنچہ غنچہ نہیں رہا بلکہ گُل ہو گیا مطلب یہ ہی کہ غنچہ ہنسنے یعنی کھلنے کے بعد اس فکر میں ہی کہ گل کا انجام کیا ہوگا۔ لیکن اس سوچ کی مقدار زانو بھر ہی۔ تامل اور سوچ کا پیمانہ مقدار زانو کو ٹھہرانے میں مصنف نے اس بات کو نگاہ رکھا ہی کہ انسان تامل اور سوچ میں سر بہ زانو ہو جاتا ہی ۱۲

[2] دنداں بہ دل افشردن: یہ فارسی اصطلاح ہی اس کے معنی ہیں مصائب کا برداشت کرنا شاعر کا مطلب یہ ہی کہ افسردہ دل کے مقابلے میں جو ایک کلفت ہی وہ بیتابی عیش کا حکم رکھتی ہی۔ واقعہ یہ ہی کہ بیتاب ہونا اور مصائب کا برداشت کرنا ہی محبت میں بنائے عیش ہی۔ ۱۲

[3] محیط کے لفظی معنے گھیرنے والے کے ہیں بحر محیط سمندر کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بر اعظم کو گھیرے ہوئے ہی۔ محیط سے پہلے لفظ بحر کے ہونے سے فارسی شاعروں نے یہ دھوکا کھایا ہی کہ اسے کسی خاص سمندر کا نام سمجھنے لگے جیسے بحر اسود بحر قلزم بحر احمر وغیرہ۔ یہی وجہ ہی کہ وہ محیط کو بہ حذف لفظ بحر بھی باندھتے ہیں۔ آشنا پیراک کو کہتے ہیں اس لیے محیط کی مناسبت سے آشنا کا لفظ خوب ہی۔ شاعر کا مطلب یہ ہی چونکہ دل کی اندرونی جلن سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں اور دل کا محیطِ گریہ ہونا ظاہر نہیں ہوتا اس لیے احباب کو موقع حاصل ہی کہ باوجود اس علم کے کہ میرے دل کی اصلی حالت کیا ہے مجھے خوش جانتے ہیں۔ ورنہ حالت تو یہ ہی کہ دل محیطِ گریہ ہی اور لب آشنائے خندہ ہی یعنی اگرچہ بظاہر خوش نظر آتا ہوں لیکن باطن میں سراپا غم بنا ہوا ہوں ۱۲

حسنِ[1] بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہی
آئنہ۔ زانوے فکرِ اختراعِ جلوہ ہی
تاکجا۔ ای آگہی[2]! رنگِ تماشا باختن؟
چشمِ واگر دیدہ۔ آغوشِ وداعِ جلوہ ہی

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل۔ کہ تجھ سے راہِ سخن۔ وا کرے کوئی
عالَم۔ غبارِ وحشتِ مجنوں ہی سربسر
کب تک خیالِ طرّۂ لیلا کرے کوئی

لہ حسن بے پروا: حسن بے نیاز۔ ایک شارح نے حسن بے پردہ لکھا ہی جو غلط ہی۔ خریدارِ متاعِ جلوہ:۔ خواستگارِ جلوہ افروزی۔ فکرِ اختراعِ جلوہ:۔ بنئے بناو سنگھار کی فکر۔ آئینے کو فکرِ اختراعِ جلوہ کا زانو اس لیے قرار دیا ہی کہ بناو سنگھار کے وقت آئینہ استعمال کیا جاتا ہی۔ مطلب یہ ہی کہ حسن باوجود کہ بے پروا اور بے نیاز ہوتا ہی۔ لیکن بناو سنگھار اور جلوہ افروزی کا وہ بھی خواستگار رہتا ہی۔ ۱۲

عہ آگہی:۔ خبرداری و ہوشیاری ضد مدہوشی۔ رنگِ تماشا باختن:۔ رنگ باختن رنگ بدلنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہی تماشا سے تماشۂ عالم مراد ہی۔ چشمِ واگردیدہ۔ کھلی ہوئی آنکھ۔ اگر ردیف کو اس سے علیحدہ کرکے ہست لگا دیا جائے تو یہ شعر بالکل فارسی ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہی اے آگاہی تو کب تک رنگ تماشا کو بدلے گی یعنی تماشائے عالم کی موجودہ کیفیت میں کب تک محو رہے گی۔ دوسرے مصرعے کا ترجمہ یہ ہی۔ کھلی ہوئی آنکھ جلوے کے رخصت کرنے کے لیے آغوشِ وداع ہی یعنی عالم بے ثبات پر آنکھ کھولنا گویا اس کی رخصت کرنے کے لیے آغوش کو کھولنا ہی۔ ۱۲

ل۱ افسردگی نہیں۔ طربِ انشائے التفات
ہاں درد بن کے۔ دل میں۔ مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر۔ کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

ل۲ چاکِ جگر سے۔ جب رہِ پرسش۔ نہ وا ہوئی
کیا فائدہ؟ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

ل۳ لختِ جگر سے ہی رگِ ہر خار۔ شاخِ گُل
تاچند؟ باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ناکامیِ نگاہ ہی برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ل۴ ہر سنگ و خشت ہی صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں۔ جنوں سے جو سودا کرے کوئی

ل۱ طربِ انشا:- خوشی پیدا کرنے والی۔ مطلب یہ ہی کہ دل کی افسردگی کے دکھلانے سے معشوق کے التفات کی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔ مراد درد بن جانے سے اگر معشوق کے دل میں گزر کیا جائے تو البتہ ممکن ہو ۱۲

ل۲ مطلب یہ ہی کہ جب چاکِ جگر کرنے پر کوئی پرسانِ حال نہ ہوا۔ تو اب جیب کو پھاڑنے سے بجز رسوائی اور کیا حاصل ہوگا ۱۲

ل۳ لختِ جگر سے مراد خونِ جگر ہی مطلب یہ ہی کہ میرے خونِ جگر کی آبیاری سے رگِ ہر خار شاخِ گل بن گئی ہی مصرعہ ثانی میں شاعر کہتا ہی کہ کب تک کوئی صحرا کی باغبانی کرے یعنی خونِ جگر دے اور اس سے آبیاری کرکے ہر شاخ کو سرسبز و شاداب بنائے ۱۱ ل۴ سنگ و خشت:- اینٹ اور پتھر۔ گوہر شکست

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے۔ عمر
فرصت کہاں؟ کہ تیری تمنا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد۔ یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ تو پھر کیا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن۔ دور ہے اسد۔
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

له شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

عه چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں۔ اور سنا کرے کوئی

مراد گوہر شکست سر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر سنگ وخشت (جو لڑکے دیوانوں کو مارتے ہیں) ایک صدف ہے جس سے گوہر شکستِ سر حاصل ہوتا ہے اس لیے جنوں سے معاملہ کرنے میں نقصان نہیں ۱۲

له ایسے قاتل کا:۔ اُس قاتل کی طرف اشارہ ہے جو بے تلوار کے قتل کرتا ہے ۱۲

عه کڑی کمان کا تیر:۔ بہت تیزی کے ساتھ اُٹھنے والا ہوتا ہے۔ شاعر نے معشوق کی بے اعتباری کی چال کو اس سے تشبیہ دی ہے وجہ مشابہت ظاہر ہے ۱۲

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ؟
کچھ نہ سمجھے خدا کرے - کوئی

نہ سنو - گر برا کہے کوئی
نہ کہو - گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو - گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند؟
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے؟
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی؟

بہت سہی - غم گیتی - شراب کم کیا ہے؟
غلام ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے؟

تمہاری طرزِ روش جانتے ہیں ہم کیا ہے؟
رقیب پر ہے اگر لطف - تو ستم کیا ہے؟[1]

سخن میں - خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی - لیکن اب اس میں دم کیا ہے؟

[1] تو ستم کیا ہے: - تو ستم اور کسے کہتے ہیں یعنی رقیب پر لطف کرنا ہی مجھ پر ستم کرنا ہے ۱۲

باغ - پا کر خفقانی - یہ ڈراتا ہے مجھے / سایۂ شاخِ گل - افعی نظر آتا ہے مجھے

[۱] جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر - معلوم / ہوں میں وہ سبزہ - کہ زہرآب اُگاتا ہے مجھے

[۲] مدعا - محوِ تماشائے شکستِ دل ہے / آئنہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

[۳] نالہ - سرمایۂ یک عالم - و عالم کفِ خاک / آسماں - بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے / دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

[۴] روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی / اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہ گزار کی

جب اس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ / لوگوں میں - کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی؟

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے / کیوں کر نہ کھائیے - کہ ہوا ہے بہار کی!

[۱] جس طرح تیغ کا جوہر صرف زہرآب میں بجھانے ہی سے نمودار ہوتا ہے اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں جس کی نشو ونما صرف غم اور غصے سے ہوئی ہے یعنی میری سرشت میں غم و غصہ ہے زہرآب سے مراد غم اور غصے سے ہے۔

[۲] فارسی اضافتوں کو دور کر کے اس شعر کو ہم نثر میں اس طرح پڑھینگے: (میرا مدعا شکستِ دل کے تماشے میں محو ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مجھے آئینوں کے گھر میں لئے جاتا ہے) مطلب یہ ہے کہ حصول مدعا سے ناامیدی اور یاس ہو جانے کے سبب) میرا دل ٹوٹ گیا ہے اور تو مدعا ہے دل کے ٹوٹتے ہوئے ٹکڑوں کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ دل آئینہ تھا جب وہ ٹوٹا تو بہت سے آئینے پیدا ہوگئے اور آئنہ خانہ بن گیا۔ طباطبائی۔

[۳] شاعر کہتا ہے کہ نالہ ہی ایک عالم کا سرمایہ ہے اور خود عالم یعنی دنیا ایک مشت خاک ہے اور آسمان بیضۂ قمری۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نالے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دنیا دار المحن ہے اور آسمان نالے کا پیدا کرنے والا ہے یعنی دنیا میں جو تکالیف پیدا ہوتی ہیں اس کا مورث آسمان ہے۔ آسمان کو بیضۂ قمری اس مناسبت سے کہا ہے کہ قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے ۱۲

[۴] کوکبہ: جماعت خادمان شاہی ۱۲۔

ہزاروں خواہشیں ایسی - کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل ؟ کیا رہے گا اس کی گردن پر؟
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے[1]

مگر - لکھوائے کوئی اس کو خط - تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح - اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ - جو - جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی ۔
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

---

[1] زلف کا پیچ و خم نکلے - یعنی زلف کھل جائے ۱۲

ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُرستم نکلے[1]
جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ؟
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے[2]
بے تکلف اے شرارِ جستہ! کیا ہو جائیے

بیضہ آسا تنگ بالِ و پر ہے یہ کنجِ قفس[3]
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

---

[1] یہ شعر اور شعر مابعد عام مطبوعہ دواوین میں نہیں ہیں قدیم قلمی تذکرے سے لیے گئے ہیں ہیں ۱۲۔

[2] شاعر شرارے (جو پتھر سے نکلتا ہے) سوال کرتا ہے کہ اگر ہم صدا ہو جائیں گے تو کوہ کے بارِ خاطر ہونگے (بارِ خاطر اس وجہ سے کہ آواز پہاڑ سے ٹکرا کر واپس چلی آتی ہے) تو اب تو بے تکلف بتا دے کہ ہم کیا ہو جائیں قاعدہ ہے کہ سائل اپنے مخاطب سے جو سوال کرتا ہے تو یہ سمجھ کر سوال کرتا ہے کہ اس سے وہی مشورہ ملیگا جو اس کا تجربہ ہے چونکہ شرر جل بجھ کر فنا ہو جانے کا تجربہ رکھتا ہے۔ اس لیے شاعر بھی اس سے اسی جواب کی توقع رکھتا ہے ۱۲

[3] دنیا کو کنجِ قفس سے نسبت دی ہے شاعر کہتا ہے کہ ہم اس دنیا سے تنگ آ گئے ہیں اگر اس کی زندگی سے نجات مل جائے تو گویا از سرِ نو زندگی مل جائے جس طرح پرند کی انڈے سے نکلنے کے بعد نئی زندگی شروع ہوتی ہے ۱۲۔

ؔلہ مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی - ہلاک ہے
موجِ شراب - یک مژۂ خوابناک ہے
جز زخمِ تیغِ ناز - نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

ؔلہ لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

ؔلہ آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُنگلی - جادہ سے

لہ ساقی کی غفلت شعاری کے ذوق نے مستی کو بھی ہلاک کر دیا ہے - یعنی مست و بے خود بنا رکھا ہے دوسرے مصرعے میں ساقی کی ادائے غفلت شعاری کا پورا اثر دکھلایا ہے کہ موجِ شراب چشمِ ساقی کی مژہ خواب آلود بن گئی ہے یعنی شراب خود سرشار اور از خود رفتہ ہو رہی ہے ۱۲

ؔلہ لعلِ بتاں: لعلِ لبِ محبوباں - مطلب یہ ہے کہ کشتہ لعلِ لبِ بتاں کی نیند قیامت کی نیند ہے کہ لبِ عیسیٰ کی جنبش بھی اس کو زندہ نہیں کر سکتی زندہ کرنا تو درکنار اس کی جنبش سے ان کی غفلت بھی ترقی کرتی جاتی ہے -

ؔلہ طوفان صدائے آب کو سن کر نقشِ پا جادے (راستے) سے کانوں میں انگلی دیے ہوئے ہے یعنی خوف زدہ ہے کہ سیلاب جب آئے گا تو اُس کو فنا کر دے گا - مولانا طباطبائی نے اپنی شرح میں

لہ
بزمِ مَے - وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا؟
شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا		مطلب نہیں کچھ اس سے - کہ مطلب ہی بر آئے

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر - کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے - شبہائے ہجراں کی

لہ
ہجومِ نالہ - حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی - ریشۂ صد نیستاں سے - خس بہ دنداں ہے
تکلف بر طرف - ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز - تیغِ تیزِ عُریاں ہے

اس شعر کا اصل یہ کہا ہے اور وہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عالم میں ہر شے کو فنا کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔"

لہ اس شعر میں موجِ بادہ کو نبضِ پری سے نسبت دی گئی ہے - وجہ نسبت یہ ہے کہ پری میں وحشت ہوتی ہے
مطلب یہ ہے کہ وحشتِ چشم کے اثر سے شیشے میں موجِ بادہ بھی اُچھل رہی ہے۔"

لہ حیرت عاجز: - عاجزِ حیرت، مطلب یہ ہے کہ ہجومِ نالہ اس بات سے عاجز ہے کہ حیرت کی وجہ سے آہ و فغاں ناممکن ہے - چنانچہ خموشی جو لازمِ حیرت ہے اس عجز کا اظہار کر رہی ہے جس پہ دنداں ہونے سے اظہارِ عجز مراد ہے اور ریشۂ نیستاں اس لحاظ سے آیا ہے کہ نیستاں کی بھی بعینہٖ یہی حالت ہوتی ہے باوجودے کہ اس سے ہزاروں بانسریاں بن سکتی ہیں اور اس لیے اس کو ہزاروں نالہ ہائے کشیدہ کا مجمع کہہ سکتے ہیں لیکن بصورتِ ظاہر ریشہ ہائے نیستاں مشابہ خس ہوتے ہیں اور خموشی

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید۔ مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

^۱ دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

^۲ غم۔ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا۔ قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

^۳ خموشیوں میں تماشا ادا - نکلتی ہے
نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے

^۴ فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا۔ جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

نیستاں خس بہ دنداں نظر آتی ہے ۱۲

^۱ متاعِ دست گرداں سے وہ مال مراد ہے جو نقد فروخت ہو۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے ۱۲۔

^۲ شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ بادِ صرصر چراغِ روشن کو بجھا دیتی ہے۔ لیکن چونکہ غم سے عاشق کی زندگی ہے اس لیے عشاق کا چراغِ روشن صرصر کی آفت میں نہیں بجھتا ۱۲

^۳ "تماشا" نگاہ کی صفت ہے یعنی تماشا دکھلانے والی۔ سرمہ کھانے سے انسان کی آواز بیٹھ جاتی ہے اس لیے سرمہ کو خامشی سے نسبت ہے۔ یعنی ایسی نگاہ نکلتی ہے جس میں اشارہ اور کنایہ کم نہیں اور یہ ادا بھی عاشق کو بھلی معلوم ہوتی ہے ۱۲۔

^۴ غنچہ چونکہ تنگ اور خلوت پسند ہے۔ اس لیے وہ بادِ صبا کو جو تنگ میں آ کر ایسا بھینچتا ہے کہ وہ شرم سے پسینے پسینے ہو جاتی ہے اور اس پسینے کا نام شبنم ہے ۱۲

[1] نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ۔ ہوا نکلتی ہے

[2] حبس جا نسیم ۔ شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ ۔ دماغ آہوے دشتِ تتار ہے
[3] کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو؟ اے خدا!
آئینہ ۔ فرشِ ششش جہتِ انتظار ہے
[4] ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے ۔ وسعتِ صحرا شکار ہے
دِل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکار ہے
[5] چھڑکے ہے شبنم آئنہ برگِ گل پر ۔ آب
اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے

[1] یعنی جس دیوانے سے وہ جھانکتا ہو اُس میں روزن نہ سمجھو بلکہ تیغ نگاہ نے زخم ڈال دیا ہو اور زخم بھی ایسا گہرا جس میں سے ہوا نکلتی ہو ۔ پھر سینۂ عاشق کی کیا حقیقت ہو جس زخم سے ہوا نکلے اور سانس ہونے لگے وہ ضرور مہلک ہوتا ہو ۱۲

[2] مطلب یہ ہو کہ نسیم سے بوئے زلفِ یار کو لے کر آہوے تتار کا دماغ نافہ بن گیا ہو یعنی آہوئے تتار بھی بوئے زلفِ یار سے فیض اُٹھانے کی احتیاج رکھتا ہو ۔ ۱۲ [3] حیرت کس کے سراغ جلوے میں معروف ہو کہ آئینہ شش جہت انتظار میں فرش بنا ہوا ہو مطلب یہ ہو کہ جب خود حیرت سراغ جلوہ میں معروف ہو تو جلوہ کس قدر حیرت زا ہوگا ۱۲

[4] جگہ کی تنگی کی وجہ سے عاشق کا غبارِ شوق ذرہ ذرہ ہو کر اُڑ رہا ہو اور یہی ذرے صحرا کا داغ بن جائینگے ہو شہ ایرانی ہیں

پیچ آپڑی ہی وعدۂ دل دار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے۔ پہ یاں انتظار ہی

بے پردہ۔ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہی

اے عندلیب۔ یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہی

دل[1] مت گنوا۔ خبر نہ سہی۔ سیر ہی سہی
اے بے دماغ، آئینہ تمثال دار ہی

غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں۔ تجھے کیا انتظار ہی

آئینہ کیوں نہ دوں[1] کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

---

[1] ایک رسم ہی کہ شگون کے لیے وقت رخصت آئینے پر پانی چھڑکتے ہیں اسی رسم سے آب بر آئینہ ریختن فارسی محاورہ پیدا ہوا ہی جس کے معنی ہیں کسی کو رخصت کرنا ۱۲

[1] خبر نہ سہی۔ یعنی دل با خبر نہ سہی خبر سے مطلب معرفت الٰہی سے ہی۔ آئینہ تمثال دار ہی اشارہ ہی دل کی طرف جو حسرتوں سے بھرا ہوا ہی مطلب یہ ہی کہ میرے دل کو ہاتھ سے نہ دے کیونکہ اس میں بہت سی حسرتیں بھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ وہ معرفت الٰہی سے مصفا نہیں ہی۔ لیکن حسرتوں کی تصویر تو اس میں موجود ہی۔ اس کی سیر ہی سہی ۱۲

ل حسرت نے لا رکھا۔ تری بزمِ خیال میں
گُل دستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

پھونکا ہی کس نے گوشِ محبت میں اے خدا!
افسونِ انتظار۔ تمنا کہیں جسے

سر پہ ہجومِ دردِ غریبی سے۔ ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک۔ کہ صحرا کہیں جسے

ل ہی چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ۔ دریا کہیں جسے

درکار ہو شگفتنِ گل ہائے عیش کو
صبحِ بہار۔ پنبۂ مینا کہیں جسے

غالب۔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہی کہ سب اچھا کہیں جسے

ل لا رکھا کا مفعول "گُل دستۂ نگاہ" ہی جو دوسرے مصرعہ میں واقع ہوا ہی۔ تری بزمِ خیال یعنی معشوق کی بزمِ خیال اشارہ ہی دلِ عاشق کی طرف جس میں معشوق ہر وقت جلوہ گر رہتا ہی۔ سویدا دل کا سیاہ نقطہ۔ مطلب یہ ہی حسرتِ نظارہ نے میرے دل میں ایک گل دستۂ نگاہ لا کر رکھ دیا ہی جسے لوگ سویدا کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں سمجھنا چاہیے کہ میرے دل میں سیاہ نقطہ نہیں ہی۔ بلکہ حسرت آلود نگاہوں کا گل دستہ ہی ۱۲

ل شوقِ عناں گسیختہ: یعنی جوشِ اشک ۱۲۔

ﻟﮧ شبنم - بہ گلِ لالہ - نہ خالی زِ ادا ہی
داغِ دلِ بے درد - نظرگاہِ حیا ہی

ﻋﮧ دل - خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بہ دستِ بُتِ بدستِ حنا ہی

ﻌﮧ شعلے سے نہ ہوتی - ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہی؟

تمثال میں تیری ہی وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گل - آغوش کُشا ہی

ﮕﮧ قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ - نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہی؟

ﻟﮧ شاعر کہتا ہی کہ گُلِ لالہ پر جو شبنم کے قطرے پڑے ہیں اس میں بھی ایک ادا نکلتی ہی یعنی وہ ایک مطلب کو ادا کر رہے ہیں گویا وہ یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ لالے میں داغ تو ہی مگر درد نہیں یہ بات اس کے لیے باعثِ شرم ہی - اور اسی شرم کی وجہ سے شبنم کے قطرے عرقِ شرم بن گئے ہیں ۱۲

ﻋﮧ مطلب یہ ہی ہمارا دل کشمکشِ حسرتِ دیدار سے خوں ہو کر بتِ بدستِ حنا کے ہاتھ میں آئینہ بن گیا ہی یعنی ہمارا دل اُس کا تغافل ظاہر کرتا ہی - بدستِ حنا - اس معشوق سے مراد ہی جو حنا لگانے کے شوق میں بدستِ حنا ہی

ﻌﮧ جو کی - یعنی جو بات کی جی جلا ہو ا - دل کڑھا ہی - افسردگیِ دل سے دل کے شعلۂ عشق سے خالی ہونے کی طرف اشارہ ہی ۱۲

ﮕﮧ اس شعر کے معنی بعض شرحوں میں مختلف بیان کیے گئے ہیں - ایک شارح نے قفسِ رنگ کو غلط بتلایا ہی وہ کہتے ہیں کہ قفسی رنگ صحیح ہی اور اسی کو صحیح مان کر اُنھوں نے شرح کی ہی - لیکن ہماری رائے میں جو معنی مولانا حسرت نے لکھے ہیں وہ قریب تر ہیں وہ کہتے ہیں " جگر سوختہ کا کوئی نشان سوا نالے کے باقی نہیں ہی پہلا مصرعہ بطور تمہید لکھا ہی کہ جس طرح قمری عشقِ سرو میں ایک کفِ خاکستر اور بلبل عشقِ گُل میں صرف رنگ ہی

[1] خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی - طرفہ بلا ہے

[2] مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

[3] معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم - آئینۂ تصویر نما ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی - ملے داد
یارب! اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

بے گانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا - تو - مری جان خدا ہے

رنگ رہ جاتی ہے - اسی طرح ہمارے جگرِ سوختہ کا کوئی نشان بجز نالے کے نہیں ہے ۱۲-

[1] تیری خونے: تیری بدمزاجی نے - وحشتِ دل، خواہشِ دل کے معنی پر استعمال ہوا ہے ۱۲

[2] مطلب یہ ہے کہ ہم چونکہ مجبوری سے محبت نباہ رہے ہیں، اس لیے ہمارے پیمانِ وفا کی مثال ایسی ہے کہ پتھر کے نیچے ہاتھ دب گیا ہو اور نہ نکال سکتے ہوں ۱۲

[3] معشوق کی تیغِ ستم کو آئینۂ تصویر نما قرار دیا - کیوں کہ جس تلوار سے اس نے اپنے چاہنے والوں کو شہید کیا وہی اب عشاق موجودہ کے گلے پر چل رہی ہے اور اس کی موجودہ تیزی اور کاٹ کو دیکھنے سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جو ظلم اس وقت کیے جا رہے ہیں وہی شہیدانِ گزشتہ کو جھیلنے پڑے ہوں گے ۱۲

منظور تھی یہ شکل - تجلّی کو نور کی[1]
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہی آنکھ تیرے شہیدوں پہ - حور کی

واعظ - نہ تم پیو - نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہی! تمہاری شرابِ طہور کی

لڑتا ہی مجھ سے حشر میں قاتل - کہ کیوں اُٹھا؟
گویا - ابھی سُنی نہیں آوازِ صور کی

آمد بہار کی ہی جو بلبل ہی نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہی - زبانی طیور کی

گو - واں نہیں - پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہی دور کی

کیا فرض ہی؟ کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ - نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں - لیکن نہ اس قدر[2]
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالب - گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب - نذر کروں گا - حضور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہی
یہ رنج کہ کم ہی مئے گلفام - بہت ہی

١ تجلی سے تجلی الٰہی مراد ہی اور یہ شعر نعت میں کہا گیا ہی ١٢
٢ شاعر کہتا ہی کہ آدمی کو اس قدر تیز زبانی نہیں چاہیے کہ ہر کوئی شکایت کرے ١٢

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں۔ کہ مجھے دُردِ تہِ جام۔ بہت ہے

لہ نے تیر کماں میں ہے۔ نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے۔ مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں۔ کہ۔ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی۔ طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد۔ کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام۔ بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو۔ مجھے کیا طوفِ حرم سے؟
آلودہ بہ مے۔ جامۂ احرام بہت ہے

عہ ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ!
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

لہ شاعر نے اس شعر میں تصوف کے اس نکتہ کو بیان کیا ہے کہ گوشہ نشینی میں کوئی خطرہ نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ ایسی آزادی جس میں خطرہ ہو قید میں پڑا رہنا بہتر ہے ۱۲۔

عہ ابرام یعنی ضد کرنا ۱۲۔

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوے[1]

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم[2]
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کیے ہوے

پھر گرمِ نالہ ہاے شرربار ہے نفس
مدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خونِ دل[3]
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوے

---

[1] جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کہہ کر شاعر نے شرابِ آتشیں کے جام کو چراغ سے نسبت دی ہے ۱۲

[2] وضعِ احتیاط : گریباں پھاڑنے میں احتیاط کرنے کی عادت سے مراد ہے

[3] مژگاں کا موقلم ہے اور خونِ دل کی روشنائی ہے اس سامان سے صفحۂ دامن پر گل کاریاں کرنا منظور ہیں ۱۲

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دِل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گُل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مَے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈھتا ہی پھر وہی فرصت۔ کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوے
غالب۔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم۔ تہیّۂ طوفاں کیے ہوے

نویدِ امن ہی بے دادِ دوست۔ جاں کے لیے[۱]
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے گر مژۂ یار۔ تشنۂ خوں ہی
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں۔ کہ ہیں روشناسِ خلق۔ اے خضر!
نہ تم۔ کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
رہا بلا میں بھی میں مبتلاے آفتِ رشک[۲]
بلاے جاں ہی۔ ادا تیری۔ اک جہاں کے لیے
فلک! نہ دور رکھ اُس سے مجھے۔ کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

[۱] مطلب یہ ہو کہ دوست نے اس درجہ بے داد کی کہ آسمان کے لیے کوئی ظلم باقی نہیں چھوڑا اس لیے اب آسمان کے ظلم وستم سے جان کو کوئی ڈر باقی نہیں رہا ۱۲
[۲] اس شعر میں رشک کا اظہار کیا گیا ہو کہ معشوق کی ادا اگرچہ بلا ہو۔ لیکن وہ دوسروں کے لیے بلا بھی کیوں ہو ۱۲؟

سلہ مثال یہ مری کوشش کی ہو کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس-آشیاں کے لیے

تلہ گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا-مری جو شامت آے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بہ قدرِ شوق نہیں-ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت-مرے بیاں کے لیے

دیا ہو خلق کو بھی-تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہو عیش-تجمل حسین خاں کے لیے

وہاں یہ مار خدایا! یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

نصیرِ دولت و دیں-اور معینِ ملّت و ملک
بنا ہو چرخِ بریں-جس کے آستاں کے لیے

سلہ اپنی کوشش کو مرغ اسیر کی اُس کوشش سے جو وہ قفس میں آشیانہ بنانے کے لیے کرتا ہو مشابہت دے کر فضول اور بے قاعدہ ثابت کیا ہو ۱۲

تلہ اس شعر میں شاعر نے ایک بہت بڑے مضمون کو دو مصرعوں میں اس خوبی سے نظم کیا ہو کہ اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں ملنی مشکل ہو شاعر کہتا ہو کہ میں جو معشوق کے مکان پر پہونچا تو اول تو چپ کھڑا رہا پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا جب خاموش کھڑے ہوئے کچھ دیر گزر گئی اور معشوق کے شوق نے بیتاب کر دیا تو بے صبری کے ساتھ پاسبان کے قدموں پر گر پڑا اس وقت وہ سمجھا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہو اور اُس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ جس کا اظہار نہ کرنا ہی بہتر ہو ۱۲

زمانہ عہد میں اُس کے ۔ ہی محو آرائش
بنیں گے اور ستارے ۔ اب آسمان کے لیے

ورق[1] تمام ہوا اور مدح باقی ہی
سفینہ چاہیے ۔ اس بحر بیکراں کے لیے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہی نکتہ سرا
صلائے عام ہی یاران نکتہ داں کے لیے

غزلیات تمام ہوئیں

[1] سفینہ بمعنی کشتی لیکن یہاں بیاض یا دیوان مراد ہی ۱۲-

قصائد

قصیدہ اوّل

منقبت میں

ساز[۱] یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار	سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار
مستیِ[۲] بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ	ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار
سبز[۳] ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ	تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

۱ مطلب یہ ہے کہ فیضِ چمن سے چمن کا ایک ذرہ بھی بے کار نہیں ہے یہاں تک کہ لالۂ بے داغ کا سایہ جو زمین پر پڑا ہے وہ دلِ بہار کا سویدا (نقطۂ خال) بن گیا ہے یعنی وہ بے کار نہیں ہے ۱۲

۲ تیغِ کوہ پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں اس لیے سبزہ کو کہسار کا جوہرِ تیغ کہا ہے مطلب یہ ہے کہ بادِ صبا کی مستی کے اثر سے وہ سبزہ جو جوہرِ تیغِ کہسار تھا ریزۂ شیشۂ مے بن گیا غرض جوہر کی مناسبت کی وجہ سے ان الفاظ کو شاعر نے جمع کیا ہے ۱۲

۳ بہار کی تاثیر سے چیتے کے داغ (جو سیاہ ہوتے ہیں) مثل جامِ زمرد سبز بن گئے ہیں شرار جو تازہ نہیں ہوتا ریشۂ نارنج کی طرح تر و تازہ ہو گیا ہے ۱۲

مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت — کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل — راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم — سرنوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال — قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز — دام ہے کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

میکدہ میں ہو اگر آرزوئے گل چینی — بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ — گم کرے گوشۂ میخانے میں گر تو دستار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر — سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ — طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

۱ آغوش میں: کیفیت میں۔ ممکن ہے دو عالم کا فشار: دین و دنیا کے غموں کا فراموش ہو جانا ممکن ہے ۱۲

۲ راہ خوابیدہ: وہ راہ جس پر کسی کی آمد و رفت نہ تھی سنسان پڑی ہوئی تھی ۱۲

۳ دو جہاں ابر: دو عالم ابر۔ کثیر ابر۔ مطلب یہ ہے فیض ہوا سے مثل یتیم کے مژگان خاک آلود کے جس سے مدتوں تک اشک جاری رہتا ہے۔ تھوڑے سے غبار میں بھی ابر کثیر موجود ہے ۱۲

۴ مطلب یہ ہے کہ بہار نے ہر چیز میں جان ڈال دی ہے ہر کفِ خاک قمری بن گئی ہے اور ہر شعلہ طاؤس بن گیا ہے۔ قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔ اس لیے کفِ خاک سے مشابہت دی ہے اور کاغذ جو آگ سے جل کر مشبک ہو جاتا ہے اس لیے اسے دام سے نسبت دی ہے ۱۲

۵ کہتا ہے کہ اگر تو باغ کو میکدہ بنانا چاہتا ہے تو باغ میں ایک جام شراب رکھ کر بھول جا فیض بہار سے ایک جام کے ہزار جام پیدا ہو جائیں گے۔

۶ خلوت کدہ غنچہ باغ یعنی خود باغ (اضافت بیانی ہے) موج گل سے گل کا کثرت سے پیدا ہونا مراد ہے ۱۲۔

۷ اس شعر میں سبزۂ کہسار کو طوطی اور لعل کو جو پہاڑوں سے نکلتا ہے منقار طوطی کہا گیا ہے۔ مدحت شاہ سے مراد مدحت حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہے ۱۲۔

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سرا — چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور — رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نُہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام — رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ — وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا — چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

ذرہ اُس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز — گرد اُس دشت کی امید کو احرامِ بہار

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیٔ ناز — عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار — دلِ پروانہ چراغاں پرِ بلبل گلزار

١ ہجوم: کا لفظ کثرتِ خمیدگی ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں ساز بمعنی سامان طنابِ معمار کی وہ ڈوری جس سے معمار دیوار کی کجی و راستی کو ناپتا ہے۔ اس شعر میں روضے کی بلندی و راستی کا بیان ہے ۱۲

٢ سبزۂ نُہ چمن: نو آسمانوں کی طرف اشارہ ہے اور حروفِ عطف جو دونوں مصرعوں میں استعمال ہوئے ہیں ان سے دو چیزوں کا مقابلہ کر کے مساوات دکھائی ہے ۱۲

٣ مروحہ بالِ پری: وہ پنکھا جو پری کے بازوؤں سے بنایا جاتا ہے ۱۲۔

٤ نجف کے گرد کے ہر ذرے پر آفتاب کو ناز ہے اور اس کے جنگل کی گرد امید کے لیے فصلِ بہار کا جامۂ احرام ہے

٥ ہر موجِ غبار: ایجاد کی انگڑائی ہے۔ یعنی نشے کے اتر جانے پر شرابِ فخر و ناز کی پھر طلب ہے۔ مطلب یہ کہ سرزمینِ نجف پیدا کر کے آفرینش کو بار بار ناز ہوتا ہے ۱۲

شکلِ طاؤس کرے آئنہ خانہ پرواز ‏— ذوق میں جلوے کے تیرے بہ ہوائے دیدار

۱ تیری اولاد کے غم سے ہے برنگِ گردوں ‏— سلکِ اختر میں مہِ نو مژہ گوہر بار

۲ ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز ‏— ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

موج میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی ‏— جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

۳ جوہرِ دستِ دعا آئنہ یعنی تاثیر ‏— یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار

۴ مژہ تک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ ‏— خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئنہ دار

۵ دشمنِ آلِ نبی کو بہ طرب خانۂ دہر ‏— عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

۶ دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

۱ـ اس شعر میں مہِ نو کو مژہ اور ستاروں کو سلکِ اشک قرار دیا ہے گوہر بار یعنی گوہر برسانے والی۔ اشک کو گوہر اس لیے کہا کہ غمِ حسنین علیہم السلام میں آنکھوں سے جو آنسو نکلتے ہیں وہ موتی کا رتبہ رکھتے ہیں ۱۲۔

۲ـ مہرِ نماز: سجدہ گاہ۔ استظہار: پشت پناہ ہونا۔ مددگار ہونا۔

۳ـ دستِ دعا آئنہ: بہ تقلیب اضافت آئنۂ دستِ دعا۔ ممدوح کے دستِ دعا کی طرف اشارہ ہے اور ممدوح کی دعا کی تاثیر کو جوہر بتایا ہے۔ آئنہ کو جوہر سے جو نسبت ہے ظاہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ممدوح کی دعا کی تاثیر جو ہمیشہ شرفِ قبولیت پاتی ہے مژگاں کے لیے جو دعا کے وقت اشک بار تھی باعثِ ناز اور خارِ غم کے لیے موجبِ حسرت ہے ۱۲۔

۴ـ جو آنکھ تیرے در کی آئنہ دار نہ ہو وہ اقبالِ نگاہ کا ماتم خانہ ہو جائے یعنی اندھی ہو جائے آنکھ کی پتلی میں سیاہی ہوتی ہے اس لیے آنکھ کو عزا خانہ کہا ۱۲۔

۵ـ خمیازۂ سیلاب: موجِ سیلاب کا استعارہ ہے ۱۲۔ ۶ـ اسدؔ آنکھ سے لے کر دل تک ایک پرتوِ

قصیدہ دوم

منقبت میں

لہ دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے؟ اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ٹہ ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

ٹہ نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

شوق کا آئینہ ہے یعنی وہ ہمہ تن شوق بنا ہوا ہے اور فیضِ معنی سے راقم حروف کا ساغر سرشار ہے یعنی اس کی تحریر مضامین منقبت سے لبریز ہے ۱۲

لہ اس شعر میں تصوف کے مسئلہ ہمہ اوست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۱۲

ٹہ زیر و بم اور ہستی و عدم میں لف و نشر غیر مرتب ہے زیر سے عدم اور بم سے ہستی مراد ہے۔ جنون و تمکین = دیوانگی اور ہوشیاری ۱۲

ٹہ جو لوگ معنی شناسی کے درپے ہیں اُن کو محض صورت شناسی مقصود ہے اور جو لوگ حق گوئی کے اظہار میں بے باکی ظاہر کرتے ہیں وہ صرف تحسین اور ستائش کے خواہشمند ہیں ۱۲۔

مثلِ[۱] مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

عشقِ[۲] - بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل - زنگارِ رُخِ آئینۂ حُسنِ یقیں

کوہ کن - گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں - آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں؟

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں - لیکن
نہ سر و برگِ ستائش - نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں! کہ عیاذاً باللہ
یک قلم - خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ لاحول لکھ - اے خامۂ ہذیاں تحریر!
یا علی - عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں!

مظہرِ فیضِ خدا - جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی - کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو وہ[۳] سرمایۂ ایجادِ جہاں - گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا
وہ کفِ خاک - ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک - خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خلق اُس کا ہی شامل کہ ہوتا ہے سدا!
بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

بُرّشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد - کہیں

---

۱ باد بہ دست سے سچائی اور خرابی اور خاک بہ فرق یعنی خاک بہ سر ہونے سے ذلت و پریشانی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں وفا کی طرح تسلیم و رضا سے کچھ فائدہ نہیں اور نقشِ پا کی طرح تمکین و خودداری سے ذلت ہی کا سامنا ہوتا ہے ۱۲

۲ اہلِ خرد خللِ حواس کو عشق کہتے ہیں اور وصل زنگار ہے حُسنِ یقین کے آئینہ کا یعنی اگر یقین کامل ہو تو وصلِ ظاہر کی ضرورت ہی نہیں ۱۲

۳ گردۂ تصویرِ زمیں - کرۂ زمین سے مراد ہے ۱۲

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے[1] — رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا! — وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر — نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب؟ — شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ — رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ — خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں — تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا؟ — کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں؟

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد — کہ سوا تیرے کوئی اُس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب — ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بس کہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول — کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز — کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیِ شوق — کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں[1]

دلِ الفت نسب[2] و سینۂ توحید فضا — نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ — وقفِ احباب گلِ و سنبلِ فردوسِ بریں

---

[1] اس سے قدم اور مجھ سے جبین فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے یعنی اُس کا قدم ہو اور میری جبین ہو ۱۲

[2] دلِ الفت نسب: الفت سے نسبت رکھنے والا دل۔ سینۂ توحید فضا: ایسا سینہ جو توحید سے معمور ہو

قصیدہ سوم

شاہِ ظفر کی مدح میں عیدالفطر کے موقع پر لکھا گیا

ہاں[1] مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص — حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اُس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ[2] دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام؟

[1] ہلالِ عید سے مراد ہے ۱۲
[2] نمّام: چغل خور ۱۲

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

ق

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن۔ ماہتاب بن۔ میں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام؟

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام؟

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟

جبکہ چودہ منازلِ فلکی
کرچکی قطع تیری تیزیِ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ "ہو بدنام"؟

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں؟ — غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے! — کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دشنام
کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس — اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد — چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ جام
بوسہ[1] دینے میں اُن کو ہے انکار — دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا[2] ہوں کہ اُن کو غصّہ آئے
کیوں رکھوں؟ ورنہ **غالب** اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ — اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام!
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام؟
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن — نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف — نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیِ الہام

[1] ابرام ضد کرنا ۱۲
[2] اُن کے چھیڑنے کے لیے غالب نام رکھا ہے ۱۲-

بزم میں میزبانِ قیصر و جم — رزم میں اوستادِ رستم و سام

ای! ترا لطفِ زندگی افزا — ای! ترا عہدِ فرخی فرجام

چشم بد دور۔ خسروانہ شکوہ — لوحش اللہ[1] عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم — جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام[2]

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے — گیو و گودرز و بیژن و رہام

مرحبا موشگافیِ ناوک — آفریں آب داریِ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف — تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

ق

رعد کا کر رہی ہی کیا دم بند — برق کو دے رہا ہی کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا — تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

ق

فنِ صورت گری میں تیرا گرز — گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام

---

[1] لوحش اللہ:- فارسی میں ماشا اللہ کی جگہ بولتے ہیں لیکن عربی میں اس کا استعمال نہیں۔ نہ لوحش کوئی عربی لفظ ہی ۱۲۔

[2] مرشد جام:- مولانا جامی سے مراد ہی ۱۲۔

ق

اُس کے مضروب کے سر و تن سے — کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام؟

ق

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے — صفحہ ہائے لیالی و ایّام
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا — مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش — لکھ دیا عاشقوں کو دشمنِ کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں — گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں — خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی — وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز — ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام
تیری توقیع[۲] سلطنت کو بھی — دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم — اُس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز — ہو ابد تک رسائیِ انجام

[۱] لف و نشر مرتب ہے ۱۲
[۲] توقیع : فرمان ۱۲

قصیدہ چہارم

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو۔ تھا گنجینۂ گوہر۔ کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا[لہ] کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ۔ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر۔ کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا۔ ہر طرف۔ زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اِک نگارِ آتشیں رُخ۔ سر کھلا

تھی نظر بندی۔ کیا جب ردِّ سحر
بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزم سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زرّیں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر۔ کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی۔ اُس پہ سرتا سر کھلا

وہ۔ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا

لہ سیمیا ایک فن کا نام ہے جس کے ذریعہ سے اشکال وہمی وغیرہ بھی نظر آتے ہیں ۱۲۔

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے / عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام / اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے / واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا[1]

قطعہ

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب / تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب / تو کہے بت خانۂ آزر[2] کھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے / منصبِ مہر و مہ و محور[3] کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک / میری حدِّ وسع سے باہر کھلا
تھا دلِ وابستہ - قفلِ بے کلید / کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا؟
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار / مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی - نفس / لوگ جانیں - طبلۂ عنبر کھلا

۱ واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا :- چہرۂ قیصر کھلا کھلا لکھا ہے یعنی صاف صاف لکھی ہے ۱۲

۲ بت خانہ آزر :- یہاں آزر بت تراش سے مراد ہے اگر ذال سے آذر سمجھا جائے تو اُس کے معنی فارسی قدیم میں آگ کے ہیں اور بت خانہ آذر کے معنی آتشکدہ مجوس کے ہو جائیں گے لیکن مجوسیوں کے آتشکدے میں بت نہیں ہوتے ۱۲

۳ محور :- کرہ متحرک کے درمیان میں ایک فرضی اور موہوم لکیر ۱۲-

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے-یوں کون جائے؟
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم-لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھ دی کب ابروئے کمان؟
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا؟

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ؟
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟
آگ بھڑکی-مینہ اگر دم بھر کھلا!

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط-میری چھاتی پر کھلا!

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا!

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا!

خامے نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا!

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
عرض سے یاں رتبۂ جوہر کھلا!

مہر کانپا-چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا!

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب علوِ پایۂ منبر کھلا

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس
اب عیارِ آبروئے زر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

ملک[1] کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح؟ ہاں اک نام ہے
دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

فکر اچھی۔ پر ستائش نا تمام
عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا

جانتا ہوں۔ ہے خطِ۔ لوحِ ازل
تم پہ اے خاقانِ نام آور! کھلا

تم[2] کرو صاحبقرانی۔ جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

[1] حکومت کرنا ممدوح کا حق تھا ممدوح کو تخت شاہی پر دیکھ کر لوگوں کو ظاہر ہو گیا کہ طغرل و سنجر فریب سے بادشاہ بن بیٹھے تھے ۱۲

[2] صاحبقران: فاتح اور جلیل القدر بادشاہ سے مراد ہے۔ لفظی معنی یہ ہیں کہ وہ بادشاہ جو قرانِ عظمیٰ کے وقت پیدا ہوا ہو۔ علم نجوم میں قرانِ عظمیٰ سیاروں کی ایک ہیئت کو کہتے ہیں جو وقتاً فوقتاً واقع ہوتی ہے اس ساعت میں جو بادشاہ پیدا ہوتا ہے اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی سلطنت بہت وسیع اور عرصۂ دراز تک قائم رہنے والی ہوتی ہے ۱۲۔

مثنوی

(آموں کی تعریف میں)

ہاں دلِ دردمندِ زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہی گلفشاں ہونا

مجھ سے کیا پوچھتا ہی "کیا لکھیے"؟
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ۔ نخلِ رُطب فشاں ہو جائے

آم کا کون مردِ میداں ہی؟
ثمرِ و شاخ۔ گوئے و چوگاں ہی

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟
آئے یہ گوے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہی جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا۔ انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہی
شرم سے پانی پانی ہونا ہی

مجھ سے پوچھو۔ تمھیں خبر کیا ہی:
آم کے آگے نیشکر کیا ہی

نہ گُل اُس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں ہو تب آئے اُس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں؟
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان
نظر آتا ہی یوں مجھے یہ ثمر
آتشِ گل پہ قند کا ہی قوام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
انگبیں کے بہ حکم ربّ النّاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
تب ہوا ہی ثمر فشاں یہ نخل
لہ
تھا ترنج زر ایک خسرو پاس
ٹہ
آم کو دیکھتا اگر اک بار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
رہبرِ راہِ خلد کا توشہ
صاحبِ شاخ برگ و بار ہی آم
تہ
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو

کوہ کن۔ باوجودِ غمگینی
پر۔ وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
کہ دوا خانۂ ازل میں مگر
شیرے کے تار کا ہی ریشہ نام
باغبانوں نے باغِ جنت سے
بھر کے بھیجے ہیں۔ سربہ مُہر گلاس
مدتوں تک دیا ہی آبِ حیات
ہم کہاں! ورنہ؟ اور کہاں یہ نخل؟
رنگ کا زرد۔ پہ کہاں بو باس؟
پھینک دیتا طلائے دست افشار
نازشِ دودمانِ آب و ہوا
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
نازپروردۂ بہار ہی آم
نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

لہ خسرو کا ترنج زر اور کسرے کا سونے کا ساگ مشہور ہی۔ کہا جاتا ہی کہ خسرو پرویز کے پاس ایسا سونا تھا کہ ہاتھ سے دبا کر جو چیز چاہو اس کی بنا لو۔ چنانچہ خسرو نے اس کا ترنج اور بعد کسرے نے اس کا ساگ تیار کرایا جو زینت دسترخوان کے لیے کھانے کے ساتھ چنا جاتا تھا خسرو اور کسرے پادشاہان فارس کے نام ہیں جو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوے ۱۲۔ ٹہ طلاے دست افشار سے اسی سونے کی طرف اشارہ ہی جس کو ہاتھ سے دبا کر جو چیز چاہو بنا لو ۱۲ تہ اس شعر میں نوبر نخل باغ سلطانی سے ولی عہد

[۱] وہ کہ ہی والیِ ولایتِ عہد — عدل سے اس کے ہی حمایتِ عہد

فخرِ دیں عزِّ شان و جاہ و جلال — زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت — چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اس کا ہما کا سایہ ہی — خلق پر وہ خدا کا سایہ ہی

اے مفیضِ وجودِ سایۂ و نور — جب تلک ہی نمودِ سایۂ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو — وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو

اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

قطعات

[۲] اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر — اے جہاں دارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پانوں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

مراد ہی ۱۲ -

[۱] پہلے مصرعہ میں عہد بہ معنی عہد و پیمانِ سلطنت دوسرے مصرعے میں بہ معنی زمانہ و وقت مستعمل ہوا ہی ۱۲

[۲] فلک منظر - ممدوح کو فلک منظر کہنے سے یہ مطلب ہی کہ شہنشاہ پر نظر کرنا گویا فلک پر نظر کرنا ہی ۱۲

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

[۱] تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

[۲] بہ سخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بکرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

ق

[۳] تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

[۴] تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل

[۵] تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

[۱] قربِ کلیم اور بذلِ خلیل ابھی تک لوگوں نے کتابوں اور روایتوں میں سنا تھا لیکن چونکہ یہ دونوں باتیں تجھ کو بھی حاصل ہیں اس لیے اب لوگوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا

[۲] تیرے سخن سے معنی و لفظ کا مرتبہ بلند ہوتا ہو اور تیری بخشش قلزم و نیل کی پیشانی پر داغ ڈالنے والی یعنی اُن کو شرمندہ کرنے والی ہو ۱۲

[۳] توفیر: زیادتی - اس شعر کو شعر مابعد کے ساتھ پڑھنے سے یہ مطلب نکلتا ہو کہ تیرے عہد میں ہمیشہ عیش و عشرت قائم رہے اس لئے چاند نے ثور سے باہر جانا چھوڑ دیا ہو اور زہرہ نے حوت میں قیام کر لیا - ثور اور حوت علم نجوم کی اصطلاح میں برجوں کے نام ہیں - ماہ کا برج ثور اور زہرہ کا برج حوت میں قیام مبارک ہوتا ہو ۱۲

[۴] انجام: کشائش ۱۲ -

[۵] اقبال یہاں ملتفت ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہو ۱۲

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ[۱] — پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم[۲] — کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی[۳] — غمِ گیتی سے مرا سینہ امر کی زنبیل
فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر — کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح — میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف — جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر — کعبۂ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری — کیا کرتے تھے تم تقریر[۴]، ہم خاموش رہتے تھے

۱ اس شعر میں شعرِ ماقبل کی توضیح کی گئی ہے۔ یعنی شاعر اپنے بخت کی ناسازی کا بیان کرتا ہے کہ پہلے تو مجھے کسی مصیبت سے نجات پانے کی تدبیر کرنے کے ناقابل بنا دیا اس کے بعد مصیبت میں مبتلا کیا۔ تاکہ میں مصیبت سے نکل نہ سکوں ۱۲۔

۲ میرے دل کی تپش خوفِ عظیم سے خالی نہیں ہے اور میرے سانس کا کھینچنا جرِّ ثقیل کی کشش سے کم نہیں ہے ۱۲۔

۳ امر کی زنبیل سے عمرو عیار کی زنبیل مراد ہے جس کا ذکر مشہور کتاب داستانِ امیر حمزہ میں آیا ہے۔ داستان میں عمرو عیار کی زنبیل کی نسبت کہا گیا ہے کہ جو کچھ اس میں پڑ جاتا غائب غائب ہو جاتا تھا اور وہ کبھی پُر نہ ہوتی تھی۔ غالب نے اس شعر میں عمرو کا املا الف سے لکھا ہے اور میم کو متحرک استعمال کیا ہے۔ حالانکہ کتاب داستانِ امیر حمزہ کا جس سے عمرو کی زنبیل کا محاورہ لیا گیا ہے موضوع حضرت امیر حمزہ عمِ حضور سرورِ کائنات ہیں اور مصنفِ داستان نے حضرت عمرو بن امیہ صحابی کو انہی داستان میں عیاری کا عہدہ دیا ہے اور طرح طرح کی عیاریوں کو اُن سے منسوب کیا ہے جس کی صرف یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے انھیں جاسوسی کے لیے مشرکین مکہ میں بھیجا تھا اور مشرکین نے حبیب صحابی کو سولی پر چڑھا دیا تھا لیکن عمرو بن امیہ صحابی مشرکین کی آنکھ بچا کر حبیب کو سولی سے اتار کر اُڑا لے گئے تھے۔ لقا کی داڑھی کی تلمیح بھی اسی داستان سے لی گئی ہے ۱۲۔ ۴ تقریر کرنا

بس اب بگڑنے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں "کیوں ہم نہ کہتے تھے"

قطعہ

کلکتے کا جو ذکر کیا۔ تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں۔ کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

قطعہ

چکنی ڈلی کی تعریف میں

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

یہاں پر بیان کرنے کے محاورے میں استعمال ہوا ہے جو فارسی محاورہ تقریر کردن کا ترجمہ ہے ۱۲

حف نظر (چشم بد دور) اردو کا محاورہ ہے اس لیے بجائے حلی کے ہائے ہوز سے اس کا املا صحیح معلوم ہوتا ہے ۱۲ کیونکہ عربی میں حف اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عام نسخوں میں یہ کتابت کی غلطی آئی ہے ۱۲۔

کلکتہ اس قطعہ کو مرزا نے کلکتے میں تصنیف کیا تھا وجہ تصنیف خود مرزا نے اپنے ایک خط بنام مرزا حاتم علی مہر میں لکھی ہے "مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے اُنھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے

[۲]خامہ انگشت بہ دنداں، کہ اسے کیا لکھیے | ناطقہ سر بہ گریباں- کہ اسے کیا کہیے
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے | حرزِ بازوے شگرفانِ خود آرا کہیے
[۳]مِسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے | داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
[۴]خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے | سرِ پستانِ پری زاد سے ماناکہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجیے | خالِ مُشکینِ رُخِ دل کشِ لیلا کہیے
حجر الاسود و دیوارِ حرم کیجیے فرض | نافہ آہوے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق | رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز | میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟ | کیوں اُسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے؟
کیوں اسے گوہرِ نایاب- تصور کیجیے | کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے؟

کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے وہاں میں نے بیٹھے بیٹھے اٹھی شعر کا قطعہ لکھ کر دیا اور صلے میں وہ ڈلی اُن سے لی" (عود ہندی)

۲ انگشت بہ دنداں:- فارسی کا محاورہ ہے اور اب اردو میں بھی مستعمل ہے بمعنی حیرت زدہ ہونے کے اسی طرح سر بہ گریباں فکر مند ہونے سے مراد ہے ۱۲

۳ مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں- یعنی سرِ انگشتِ مسی آلودہ حسیناں- انگشتِ مسی آلودہ حسیناں سے وہ انگلی مراد ہے جو بیچ کی انگلی اور چھنگلیا کے درمیان میں ہوتی ہے کیونکہ عموماً اسی انگلی سے عورتیں مسی لگاتی ہیں اور اُس کو مسّی کی انگلی کہتے ہیں ۱۲

۴ مانا کہیے= مشابہ کہیے- یہ محاورہ بھی فارسی کا محاورہ ہے جو مشابہ مانندگی سے مشتق ہے ۱۲-

کیوں[1] اسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

قطعہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

سہرا

خوش[2] ہو اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر[3] سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

[1] تکمہ گھنڈی۔ لیکن اردو میں اس حلقے کو کہتے ہیں جس میں گھنڈی ڈالتے ہیں۔ یہ استعمال اصل معنی کے خلاف رائج ہو گیا ہے۔ ناقہ سلمیٰ = سلمیٰ کی اونٹنی ۱۲

[2] محمد سراج الدین ابوظفر بادشاہ کے چھوٹے اور چہیتے بیٹے جواں بخت کی شادی کے موقعے پر مرزا صاحب نے یہ سہرا لکھا تھا۔ شہزادہ جواں بخت نواب زینت محل کے بطن سے تھے۔ ان بیگم صاحب کو بادشاہ کے مزاج میں

[3] شاعر نے انگریزی لفظ نمبر کو [illegible] استعمال کیا ہو [illegible] عربی زبان [illegible] ہو گیا ۱۲

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یہ بھی اک بےادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں۔ ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانبارئ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں۔ **غالب** کے طرفدار نہیں
دیکھیں۔ کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

بڑا دخل تھا اسی وجہ سے بادشاہ شہزادہ جواں بخت کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اُس کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ اُن کی شادی میں بہت کچھ دھوم دھام ہوئی تھی۔ اس موقعے پر بیگم کے ایما سے مرزا غالب نے یہ سہرا کہا اور ایک زرنگار کاغذ پر لکھ کر سونے کی کشتی میں لگا کر بڑے تکلف کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا۔ مقطع کو سُن کر بادشاہ کا خیال ہوا کہ یہ اُن کے استاد ذوق پر تعریض ہے چنانچہ اوستاد ذوق نے بھی بادشاہ کے ایما سے ایک سہرا اسی ردیف و قافیہ میں لکھا تھا جو درج ذیل ہے۔

اے جوان بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رخِ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے گھوڑے پہ جو تیرے مہ واختر سہرا

تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تا بہ بارش ہے بنا ایک سراسر سہرا

قطعہ

نوٹ

مرزا نے اپنے سہرے کے جواب میں استاد ذوق کا سہرا سن کر اس قطعے کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا۔ عام دیوانوں میں دیگر قطعات کے سلسلے میں اس قطعے کو سہرے سے پہلے جگہ دی گئی ہے لیکن ہم نے واقعے کے لحاظ سے اس کو سہرے کے بعد درج کیا ہے تاکہ سہرا پڑھنے کے بعد اس کے مطالب بخوبی ذہن نشین ہو سکیں ۱۲

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار رہی دستار کے اوپر سہرا

ایک گھر بھی نہیں مسکانِ گہر میں چھوڑا
تیرا انوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ صبا
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشیدِ فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے ہٹا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظارہ ترے روئے انور پہ سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون؟ اور ریختہ - ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں - وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی - پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مدح

نصرت الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے - تو کس بات سے ہے

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا - خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو ٭ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہاتھ سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

آخری چہار شنبہ

ہے[^1] چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشک بو کی ناند

جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

[^1]: ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ کو عوام میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم صحت سمجھا جاتا ہے اور اس لیے آج کے دن خوشی مناتے ہیں اور باغوں کی سیر کو نکلتے ہیں اور اس قطعہ میں اسی خوشی کی طرف اشارہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے زمانے میں بادشاہ کے یہاں آج کے دن خوشی منائی جاتی تھی اور نقرئی و طلائی چاندی کے چھلے تقسیم ہوتے تھے۔ ۱۲

غالب یہ کیا بیاں ہی بجز مدح بادشاہ
بھاتی نہیں ہی اب مجھے کوئی نوشت وخواند

مدح شاہ

ای شاہِ جہاں گیر - جہاں بخش جہاندار
ہی غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اُس عقدے کو سو بھی باشارت

ممکن ہی کرے؟ خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہی فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت

ہی نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہی داغِ غلامی ترا - توقیعِ امارت

قطعہ

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ تمازت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہی گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہی گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیوں کر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر؟
قاصر ہے ستایش میں تری میری عبارت

نو روز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظّارگی[1] صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب[2] مبارک!
غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

[1] نظّارگی۔ نظّارہ کرنے والا ۱۲

[2] شرفِ مہرِ جہاں تاب۔ مراد شرفِ آفتاب سے ہے یعنی تحویلِ آفتاب حمل میں جس کو شرفِ آفتاب کہتے ہیں تجھے مبارک ہو۔ عتبہ۔ ڈیوڑھی ۱۲

گزارشِ مصنّف بحضورِ شاہ

لہ اے شہنشاہِ آسماں اورنگ! / عہ اے جہاں دارِ آفتاب آثار

تھا میں اِک بے نوائے گوشہ نشیں! / تھا میں اِک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی / ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

تلہ کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز / روشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری / ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی / جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں / بادشہ کا غلامِ کارگزار

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح / تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر / نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے۔ تو کس سے کہوں؟ / مدّعائے ضروری الاظہار

لہ شہنشاہِ آسماں اورنگ:- وہ بادشاہ جس کا تخت آسمان ہو۔

عہ جہاں دارِ آفتاب آثار:- وہ بادشاہ جس کی روشنی مثل آفتاب کے پھیلی ہوئی ہو۔ چونکہ اس قطعہ میں آگے چل کر مصنف کو جاڑے کے موسم میں سردی کھانے کی تکلیف کا حال بیان کرنا ہے اس لیے ممدوح کو آسمان آثار کہنا ایک لطیف صنعت ہے ۱۲۔

سہ روشناسِ ثوابت و سیار:- یعنی ثوابت و سیارے مجھے پہچاننے لگے ۱۲۔

پیر و مرشد۔ اگرچہ مجھ کو نہیں ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ[۱] تو جاڑے میں چاہیے آخر تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟ جسم رکھتا ہوں۔ ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کی سال کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان؟ دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی وَقِنا رَبّنا عذابَ النّار
میری تنخواہ جو مقرر ہے اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج[۲] مجھ سا نہیں زمانے میں شاعرِ نغز گوے و خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سُنیے ہے زباں میری۔ تیغ جوہر دار
بزم کا التزام اگر کیجیے ہے قلم میری۔ ابرِ گوہر بار
ظلم ہے۔ گر نہ دو سخن کی داد۔ قہر ہے۔ گر کرو نہ مجھ کو پیار

[۱] بادِ زمہریر:- ٹھنڈی ہوا۔ زمہریر موسمِ سرما کے معنی پر آتا ہے ۱۲-
[۲] نغز گو:- خوش گو ۱۲-

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

سیہ گلیم[۱] ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے — جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے — کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

قطعہ

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی — مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین[۲] دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد — تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

۱ سیہ گلیم = سیہ بخت۔ شریک غالب: = وہ شریک جس کو غلبہ حاصل ہو اگر کسرہ اضافی سمجھا جائے تو اس کے معنی غالب کا شریک یعنی مصنف کا شریک سمجھا جائے گا ۱۲۔
۲ تین مسہل لینے کے لیے یونانی طبیبوں کے عمل اور رواج کے موافق بارہ دن صرف ہوتے ہیں

قطعۂ تاریخ

خجستہ انجمنِ طوے[1] میرزا جعفرؔ
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہی جی محظوظ

ہوئی ہی ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ
نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی "محظوظ"

۱۸۵۴ء

دیگر

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید

کہا غالبؔ سے تاریخ اس کی کیا ہی؟
تو بولا ! "انشراحِ جشنِ جمشید"

۱۲۷۰ھ

اس کی تفصیل بیان کرکے ۱۰ دن کی رخصت شاعر نے طلب کی ہی۔ مسہل سے پہلے کم سے کم تین دن منضج پلاتے ہیں اور ہر مسہل کے بعد ایک دن تبرید اور پھر تینوں مسہل ختم ہو جانے پر تین دن اور تبریدیں پی جاتی ہیں۔ تبرید سے مراد اُس دوا سے ہی جو مسہل کے بعد پلائی جاتی ہی ۱۲۔

[1] طوے: بیاہ ۱۲۔

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
لہ کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
اس سے ہی یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعیات

سہ بعد از اتمام بزم عیدِ اطفال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
ایّامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
اے عمرِ گزشتہ۔ یک قدم استقبال

دیگر

سہ شب۔ زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
ہر قطرۂ اشک۔ دیدۂ پُر نم تھا

لہ کانوں پہ ہاتھ دھرنا ہمارے محاورے میں کسی امر کی ناواقفیت کے اظہار کے موقعہ پر بولا جاتا ہے اور پہلے زمانہ میں شاہی مجلس میں جب درباری ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو بجائے پیشانی پر ہاتھ رکھنے کے رخ اور کانوں کی طرف ہاتھ لے جاتے تھے ان دونوں باتوں نے اس قطعہ میں ایک مضمون لطیف پیدا کر دیا ہے ۱۲

سہ اس رباعی میں چند روز کے لیے عمر رفتہ کے پلٹ آنے کی تمنا کی ہے ۱۲

سہ زلف و روئے یار کے تصور میں جو آنسو نکلے ان میں زلف کی سیاہی اور روے یار کی سفیدی بھی شامل تھی یعنی ہر قطرۂ اشک میں آنکھ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس لیے ہزار آنکھ سے رونا کہا ۱۲-

دیگر

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں[1] کے لیے۔ گیا ہے کیا کھیل نکال

ایضاً

دِل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید[2] سہی
بے تابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن۔ اے تجلی افسوس!
تکرار روا نہیں۔ تو تجدید سہی

ایضاً

ہے خلق۔ حسد قماش[3]۔ لڑنے کے لیے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد۔
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

[1] لڑکوں سے مراد حسینانِ کم سن ہیں ۱۲۔ [2] جانِ دردِ تمہید = وہ جان جس کا آغاز درد سے ہو یعنی زندگانی پر درد سہی شعرِ اول میں یعنی برداشت کے آیا ہے مطلب یہ ہے جب ہم دل رکھتے تھے اس وقت ہم نے زندگانی پر درد اور رشک و حسرتِ دید کی بے تابی کو برداشت کر لیا اور اب تو ہم ہیں اور افسردگی ایسی حالت میں اے تجلی یار اگر تکرار ممکن نہیں تو تجدید ہی سہی یعنی تیری تجلی نے جو سوز و گداز پہلے پیدا کیا تھا اگر اس کا اعادہ محال ہے تو اس کو از سر نو پیدا کر دے ۱۲ [3] حسد قماش

دل سخت نژند ہو گیا ہی گویا
اُس سے گلہ مند ہو گیا ہی گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالب مُنہ بند ہو گیا ہی گویا

ایضاً

دُکھ[1] جی کے پسند ہو گیا ہی غالب
دل رک کر بند ہو گیا ہی غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہی غالب

مشکل ہی زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

بھیجی ہی جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال
ہی لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہی دولت و دین و دانش و داد کی دال

یں وہی ترکیب ہی جو حسد شعار میں ہی جس سے مراد حاسد سے ہی لفظی معنی میں "وہ شخص جس نے حسد کا جامہ پہن لیا ہی" تلاش سے مراد تلاشِ معاش ہی ۱۲

کاغذ باد، پتنگ۔ شاعر نے اس قطعہ میں اس زمانہ کے لوگوں کے منافقانہ دوستی کی طرف اشارہ کیا ہی وہ کہتا ہی کہ دنیا میں دو شخصوں کا ملنا ایسا ہی جیسا آپس میں دو پتنگوں کا ملنا کہ ان کے ملنے سے لڑنا مقصود ہی ۱۲

[1] اس رباعی کے دوسرے مصرعہ میں بعض دیوانوں میں "رک" کو بہ تکرار لکھا ہی جس کی وجہ سے وزن رباعی سے دو حرف زائد ہو جاتے ہیں ۱۲

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافلؔ و عالی باہم
ہے اب کی شبِ قدر و دوالی باہم

دیگر

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزایشِ اعداد کرے

دیگر

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں۔ بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

دیگر

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا
کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

لہ یہاں اسافل سے مرتبہ سافل مراد ہے اور دیوالی کی بت پرستی کی طرف اشارہ ہے عالی سے عبادت شب قدر مراد ہے ۱۱

دیگر

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے — کرتے ہیں درنگ کام کرتے والے

کہتے ہیں۔ کہیں خدا سے اللہ اللہ — وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

دیگر

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟ — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟

روزہ مرا ایمان ہے۔ غالب۔ لیکن — خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

دیگر

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے — بھیجے ہیں جو ارمغاں۔ شہِ والا نے

گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار — فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

دیگر

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے — ثاقبؔ حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے

حاجی کلو کو دیکھے بے وجہ جواب[۱]
غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

ایضاً

اے روشنیٔ دیدۂ شہاب الدین خاں[۲]
کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں

وہ اشعار اور قطعات جو دیوان مروجہ میں نہیں ہیں

قطعہ

ایک اہل درد نے سنسان جو دیکھا قفس[۳]
یوں کہا آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے
یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

ایضاً[۳]

اُٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائر مجروح پر بستہ
ٹپکتا تھا سر شوریدہ دیوار گلستاں سے

۱ و ۲ یہ دونوں رباعیاں اردوئے معلیٰ سے لی گئی ہیں کسی دیوان میں شامل نہیں تھیں مرزا نے ایک خط میں علائی کو لکھکر بھیجی تھیں۔

۳ یہ دونوں قطعے حضرت جوش بلگرامی ایڈیٹر ذخیرہ کی عنایت سے ہمیں دستیاب ہوئے ہیں انھوں نے انکو اپنی زیر تالیف کتاب سوانح عمری نواب عماد الملک بلگرامی میں درج کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ مرزا غالب کے ہیں

کہا میں نے کہ او گم نام آخر ماجرا کیا ہے
ترا ہی کام تجھکو کس ستمگر آفتِ جاں سے

ہنسا کچھ کھل کھلا کر پہلے پھر مجھکو جو پہچانا
تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہے پلکوں کے داماں سے

کہا میں صید ہوں اُس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے

اُسی کی زلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھکو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشمِ غور جو دیکھا مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر رہ گیا یوں خاک میری آہِ سوزاں سے

غزل

شبِ[۱] وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ

خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟
کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پُرشکن تکیہ

بنا ہے تختۂ گلہائے یاسمیں بستر
ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ

فروغِ حُسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رختِ خواب ہے پرویں، تو ہے پرن تکیہ

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخِ سیم تن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر
اُٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگرچہ زانوئے نل پر رکھے دمن تکیہ

دونوں قطعے نواب صاحب ممدوح کے اکثر وردِ زبان رہتے ہیں اور انھیں کی زبان سے ہم نے انھوں کے سنے تھے بعض نقادانِ سخن ان قطعات کے طرزِ بیان کو حضرت غالب کے رنگ سے جدا نہیں سمجھتے ہیں۔ واللہ اعلم

[۱] یہ غزل الہلال کلکتہ مطبوعہ ۲۲ جنوری ۱۹۱۳ء سے لی گئی ہے جریدۂ مذکور نے حضرت طالب دہلوی کے حوالہ سے اس کو مرزا کے غیر مطبوعہ کلام کے ذیل میں شائع کیا تھا۔ ۱۲

بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ

یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک
رکھو نہ شمع پہ اے اہلِ انجمن تکیہ

اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے لیکن
اُٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ

غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو
ہوئی ہے اس کو مری نعشِ بے کفن تکیہ

شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے تن تکیہ

روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ "تکیہ کلام"
اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"

ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کُہن تکیہ

جس[۱] دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

میں[۲] ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش۔ اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرتِ ماہ!
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بت۔ پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی

حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

۱؎ مرزا صاحب اتفاقاً قید ہو گئے تھے وہاں کپڑوں میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔ اُن کو مرزا چن رہے تھے ایک رئیس نے جا کر پرسشِ حال کی مرزا نے فی البدیہہ شعر پڑھا۔ بخیے کے ٹانکوں سے جوؤں کی تشبیہ کس قدر نادر اور نفیس ہے؟"

۲؎ یہ غزل مرزا نے دیوانِ ریختہ مرتب ہونے کے بعد ۱۲۸۵ھ میں مولانا علائی اپنے شاگرد رشید کو لکھ کر بھیجی تھی اس لیے اصل دیوان میں شامل نہیں ہے اردوئے معلّٰی سے لی گئی ہے۔

تیرے کوچے کا ہی مائل دلِ مضطر میرا | کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہی واعظ | خلد بھی باغ ہی خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب | سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھکو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں | زہر کچھ اور سہی آب بقا اور سہی
مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی | ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

بہت سہی[له] غمِ گیتی شراب کم کیا ہی | غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہی
رقیب[عه] پر ہی اگر لطف تو ستم کیا ہی | تمہاری طرزِ روش جانتے ہیں ہم کیا ہی
کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے | کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہی
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود | کسے خبر ہی کہ واں جنبشِ قلم کیا ہی
نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا | خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہی
وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہی ہمدم | وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہی
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی | یقیں ہی ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہی

قطعہ[سه]

بسکہ فعّالِ ما یرید ہی آج | ہر سلحشور انگلستان کا

له یہ پوری غزل اصل دیوان میں شامل نہیں ہی۔ دسمبر ۱۸۶۶ء میں اصل دیوان کے مرتب ہونے کے کئی سال بعد ۱۲ علائی کو لکھکر بھیجی تھی اور انکو ہدایت کی تھی کہ وہ اسکو دیوان کے حاشیہ پر چڑھا دیں۔ ۱۲

عه اصل دیوان میں یہ مطلع مصرعین کی تقدیم و تاخیر کے ساتھ درج ہی ۱۲

سه یہ قطعہ مرزا نے ۱۸۵۸ء میں مولانا علائی کو ایک خط میں لکھکر بھیجا تھا جس میں دہلی کی اس دردناک حالت کا جو بعد ہنگامہ ۱۸۵۷ء ہوا نقشہ کھینچا ہی (اردوئے معلی نوشتہ ... آئندہ ہی)

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے ۔۔۔ زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے ۔۔۔ گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک ۔۔۔ تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک ۔۔۔ آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا ۔۔۔ وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ ۔۔۔ سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ۔۔۔ ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یا رب ۔۔۔ کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

بہ رہنِ شرم ہے باوصفِ شوخی۔ اہتمام اس کا ۔۔۔ نگیں میں جوں شرارِ رنگ۔ ناپیدا ہے نام اس کا
مسی آلودہ ہے مُہرِ نوازش نامہ ظاہر ہے ۔۔۔ کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اس کا
بامیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت ۔۔۔ مبادا ہو عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اس کا

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیرے۔ دل بیتاب تھا ۔۔۔ شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ ۔۔۔ ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس، مضراب تھا

دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی ۔۔۔ وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا

(متعلق ۲۴۷) خیال نہ کرنیوالا۔ نابریدنی جس کام کا ارادہ کر لیا گیا ہو۔ مسلح شورہ، وہ فوجی اشخاص جن کے جسم پر اسلحہ سجے ہوں۔ اور قواعد کرنے میں اسلحہ کی جھنکار سنائی دے۔ ۱۲

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا	غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے	رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا
معزولیِ تپش ہوئی۔ افراطِ انتظار	چشمِ کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج
میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ	جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں
مےکشی کو نہ سمجھ بے حاصل	بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں
ہے نزاکت بس کہ فصلِ گل میں معمارِ چمن	قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن
ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج	خارِ الم سے پشت بہ دنداں گزیدہ ہوں میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں
ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو	برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو
ہندوستان[۱] سایۂ گُلِ پائے تخت تھا	جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

۱؎ اس غزل کے صرف دو شعر اصل دیوان میں ردیف ہ کے تحت میں درج ہیں

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ ہاں
دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں۔ نہ پوچھ

بہجومِ ریزشِ خوں کے سبب رنگ اڑ نہیں سکتا
حنائے پنجۂ صیاد۔ مرغِ رشتہ بپا ہے

غالب زبس کہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

بہا ہے یاں تک اشکوں سے غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں ہر اک پارہ دل پائے در گل ہے

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو
تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

حیراں ہوں شوخیِ رگِ یاقوت دیکھ کر
یاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برابر

[1] چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

[1] یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر ہے لیکن اس کے اصلی مصنف کے نام سے لوگ ناآشنا ہیں۔ بعض اسے میر تقی کا شعر بتاتے ہیں بعض مرزا غالب کا۔ لیکن کلیاتِ میر میں اس کا پتا نہیں۔ نہ دیوانِ غالب میں ہے۔ لیکن حضرت شوکت بلگرامی نے اس شعر کی بابت اردوئے معلیٰ علی گڑھ مطبوعہ